دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۵ ماہ صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۱۰ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ایران کلچر ہاؤس، سفارت خانہ اسلامی جمہوریہ ایران، دہلی شروع ہی سے ہندوستان اور ایران کے درمیان علمی اور ثقافتی تعلقات کے فروغ کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ لیکن جب سے کلچرل کونسلر کی حیثیت سے اس کی زمام اختیار ڈاکٹر کریم نجفی کے ہاتھ میں آئی ہے اس کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا ہے اور اس کے اندر ایک نئی اقدامیت اور فعالیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نجفی ایک قدیم علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں اور علم کے قدیم اور جدید دونوں دھاروں سے سیراب ہوئے ہیں۔ مذہبی تعلیم میں تخصص کے بعد یونیورسٹی آف ایران سے اسلامیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور پوسٹ ڈاکٹریٹ کی اسناد حاصل کیں۔ شہید بہشتی یونیورسٹی، علامہ طباطبائی یونیورسٹی اور پیام نور یونیورسٹی میں تاریخ پڑھائی۔ پیام نور یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ہندوستان اور ایران کی مختلف علمی اور ثقافتی تنظیموں کے ممبر ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں مغل ایران تعلقات پر ان کا تحقیقی مقالہ طبع ہو کر قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تین اور کتابیں اور ۵۰ مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ کئی مآخذ جن میں دبستان مذاہب جیسی اہم کتاب شامل ہے، تحقیق و تہذیب کے بعد زیر طبع ہیں۔ قند پارسی، انڈو ایران سوسائٹی کے سہ ماہی مجلہ اور سہ ماہی مجلہ راہ اسلام کے ایڈیٹر ان چیف ہیں۔ ہندوستان، انگلینڈ، شام، اٹلی، پاکستان، ایران اور چین میں منعقد ہونے والے متعدد سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ایران کلچر ہاؤس کے تعاون سے کئی کامیاب سمینار کرا چکے ہیں جن میں گذشتہ دنوں تاج محل پر ہونے والا بین الاقوامی سمینار شامل ہے۔ بڑی پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ تصنع اور تکلف سے آزاد اور علم و دانش کے دلدادہ ہیں۔ چند سال پہلے جب تہران میں راقم حروف سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تو بغیر کسی سابقہ تعارف کے بڑے لطف و کرم کا معاملہ کیا۔ اس کی خوش گوار یاد اب بھی نہاں خانہ دل میں محفوظ ہے۔ ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے علمی اداروں تک خود پہنچیں، ان کے حالات سے آگاہی حاصل کریں اور ممکنہ حد تک ان کو امداد اور تعاون فراہم کریں۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں ان کی تشریف آوری اسی دلچسپی کی مظہر ہے۔

ہماری دعوت پر ڈاکٹر نجفی ۷ رجنوری کو دارالمصنفین تشریف لائے اور موسم کی سختی اور ضروری سہولیات

کے فقدان کے باوجود ۸ /جنوری کی صبح تک یہاں قیام کیا۔ دوران قیام اس عظیم علمی اور تحقیقی ادارے کے بارے میں تفصیلی واقفیت حاصل کی۔ لائبریری اور میوزیم کو بہت دلچسپی سے دیکھا اور مخطوطات کے بارے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب بھی کیا۔ شام میں ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں معززین شہر اور وابستگان دارالمصنفین کے ایک منتخب مجمع نے شرکت کی۔ راقم حروف نے معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے اسلامی علوم اور فارسی زبان وادب کے میدان میں علامہ شبلی اور دارالمصنفین کی گراں قدر خدمات کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر نجفی نے اپنی تقریر میں ہندوستان اور ایران کے درمیان قدیم اور گہرے روابط پر روشنی ڈالی اور فارسی زبان وادب کی ترویج کے لیے علامہ شبلی کی ناقابل فراموش خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس سے پہلے لائبریری میں ایک پروقار تقریب میں ایران کلچر ہاؤس سفارت خانہ اسلامی جمہوریہ ایران اور دارالمصنفین کے درمیان ایک توافق نامہ (Memorandum of Understanding) پر دستخط ہوئے۔ دارالمصنفین کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے انشاء اللہ ایران اور دارالمصنفین کے درمیان علم وتحقیق کے میدان میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کی راہ باز ہوگی اور نئے امکانات روشن ہوں گے۔ یہ دراصل اسلامی علوم اور فارسی زبان وادب کے میدان میں دارالمصنفین کی گراں قدر خدمات کا اعتراف ہے۔ اس توافق نامہ میں شامل مختلف دفعات کے تحت دارالمصنفین اور ایران کے درمیان اسکالرز کا تبادلہ ہوگا۔ مطالعہ وتحقیق کے لیے ایرانی اسکالرز دارالمصنفین آئیں گے اور دارالمصنفین کے اسکالرز ایران جائیں گے۔ باہمی دلچسپی کی ادبی کتابوں بالخصوص شعرالعجم کی اشاعت میں ایران کلچر ہاؤس تعاون کرے گا۔ ایران کلچر ہاؤس سے متعلق پرشین ریسرچ سنٹر اکیڈمی میں محفوظ مخطوطات کی فہرست سازی میں مدد کرے گا۔ ایران کلچر ہاؤس اکیڈمی کے مخطوطات کی اشاعت میں تعاون کرے گا۔ ایران کلچر ہاؤس منتخب کتابوں کے اردو، انگریزی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کے لیے ضروری وسائل فراہم کرے گا۔ ادب، تاریخ اور ثقافت سے متعلق موضوعات پر باہمی اشتراک سے سمینار اور ورک شاپ کا انعقاد کیا جائے گا۔ یہ علمی مجالس دارالمصنفین اور ایران کلچر ہاؤس، دہلی دونوں جگہ منعقد ہوں گی۔ مزید برآں دونوں مراکز کے درمیان رسائل اور کتابوں کا تبادلہ ہوگا۔ ایران میں بڑے پیمانے پر قدیم مآخذ اور جدید تحقیقات کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس طرح انشاء اللہ ہماری لائبریری کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی صورت پیدا ہوگی۔ ڈاکٹر نجفی نے یہ بھی اعلان کیا کہ ایران کلچر ہاؤس علامہ شبلی کے نام پر ایک ایوارڈ قائم کرے گا۔ یہ

ایوارڈ علامہ شبلی پر بہترین کام کرنے والے اسکالرز کو تفویض کیا جائے گا۔ یہ ایک بہت اہم ابتداء ہے، توقع ہے کہ اس پر عمل درآمد کا سلسلہ جلد شروع ہو جائے گا۔

۲۷ر دسمبر کو غزہ پر اسرائیل کے وحشیانہ حملہ پر ایک سال پورے ہوگئے۔ اس مناسبت سے جب غزہ فریڈم مارچ (Gaza Freedom March) کی تنظیم کا اعلان کیا گیا تو اس میں شرکت کے لیے دنیا بھر سے بے شمار درخواستیں موصول ہوئیں۔ انتظام کی دشواریوں کے پیش نظر منتظمین نے اس میں شرکت کے لیے ۴۲ ممالک سے تعلق رکھنے والے صرف ۱۴۰۰ افراد کا انتخاب کیا۔ شرکاء کی غالب اکثریت مغربی ممالک سے تعلق رکھتی تھی۔ عرب ممالک سے شرکت محض برائے نام تھی۔ اس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے جو چند لوگ قاہرہ پہنچے تھے ان میں مجلس مشاورت کے سابق صدر، ملی گزٹ کے ایڈیٹر اور دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب بھی شامل تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ مارچ میں شامل ہونے والے لوگ قاہرہ میں اکٹھا ہوں گے اور رفح کراسنگ سے غزہ میں داخل ہوں گے جہاں ۳۱ر دسمبر کو باشندگان غزہ کے ساتھ مل کر ایک عظیم الشان مارچ منظم کیا جانے والا تھا۔ تنظیم کے نمائندے ہفتوں پہلے سے اس سلسلہ میں مصری وزارت خارجہ سے گفتگو میں مصروف تھے۔ اندازہ یہ تھا کہ مصری حکومت مارچ میں حصہ لینے والوں کو غزہ جانے کی اجازت دے دے گی۔ منصوبہ کے مطابق تمام شرکاء ۲۸ر دسمبر کی صبح تک غزہ پہنچ چکے تھے۔ لیکن عین وقت پر مصری حکومت نے رفح کے راستے غزہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور بزور قوت اسے روک دیا۔ مندوبین چند دنوں تک تو اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتے رہے اس کے بعد مجبوراً نامراد اور دل شکستہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ مصر جو غزہ کے مظلومین کے مصائب کو کم کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا اور جس کا بحیثیت ایک اہم عرب اور مسلمان قوم یہ فرض بنتا تھا وہ اس سلسلہ میں کلیدی کردار ادا کرے، دوسروں کو بھی غزہ کے مظلوم اور بے کس باشندوں کے آنسو پونچھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس باب میں حکومت مصر کی سنگ دلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب وہ غزہ سے ملنے والی اپنی سرحد پر ایک آہنی دیوار تعمیر کر رہی ہے تاکہ سرنگوں کے ذریعہ سامان رسد کی فراہمی کو یکسر روکا جا سکے۔ جب یہ دیوار پوری ہو جائے گی تو اس کی لمبائی قریب گیارہ کیلومیٹر ہوگی اور اس کی گہرائی زمین کے اندر اٹھارہ میٹر ہوگی۔ اس طرح غزہ کے تباہ کن محاصرہ میں اسرائیل کو مصر کی غیر مشروط اور مکمل حمایت حاصل ہے۔ دنیا کے وہ تمام ممالک جو اس ظلم کے خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں وہ بھی انصاف کے اس قتل میں اسرائیل کے ساجھی دار ہیں۔

مقالات

قرآن عظیم اور انسان کی اصل حقیقت

جناب مولانا سعید الرحمان ندوی

(۲)

ان آیات کی مزید تائید وتقویت کے لئے حسب ذیل آیات بھی ملاحظہ ہوں:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ. الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (زخرف: ۹-۱۰)

اگر آپ ان سے دریافت کریں گے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ انہیں اسی زبردست ہمہ دان ذات نے پیدا کیا ہے جس نے زمینوں کو تمہارے لئے بچھونا بنایا ہے، اور ان میں تمہارے لئے راستے بھی بنادئے ہیں، تاکہ تم ہدایت پاسکو۔

السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ کی ترکیب ایک اور مرتبہ اس بات کا فائدہ پہنچارہی ہے کہ یہاں بھی اُلْأَرْضُ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس سے ساتوں آسمانوں کی ساری زمینیں مراد ہوجاتی ہیں۔ اب اس پس منظر اور ٹھیک اسی تسلسل میں متصل اگلی آیت میں بھی اُلْأَرْضُ کا دوبارہ استعمال اس کی جنسیت ہی پر دلالت کرنے والا ہے۔ لہذا اس آیت میں الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا کے ذریعے یہ معنویت پیدا کی جارہی ہے کہ کائنات کی ساری ہی زمینوں کو ہمارے لئے بچھونا بنادیا گیا ہے!! چنانچہ اب ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں

ناظم، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا (جس نے زمینوں کو تمہارے لئے بچھونا بنایا) اور سابقہ شمارے میں مَهَّدْتُ لَهٗ تَمْهِيْدًا (میں نے اسے کثرت سے بچھونے فراہم کئے) باہم کس قدر مشابہت رکھنے والے اور ایک دوسرے کی شرح و تفسیر کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ اگر سابقہ شمارے میں مَهَّدْتُ لَهٗ تَمْهِيْدًا سے حقیقتاً کیا مراد ہے موجودہ شمارہ اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالنے والا ہے تو خود مَهَّدْتُ لَهٗ تَمْهِيْدًا بھی موجودہ شمارے میں اَلْأَرْضُ بطور اسم جنس مستعمل ہونے کی خبر دے رہا ہے۔ نیز اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ پچھلے شمارے کے تحت طٰہٰ:۵۳ میں سماوات کے ذکر کے بغیر ہی ٹھیک اسی ترکیب اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا کے ذریعے ساری زمینوں کو ہمارے لئے بچھونا بنائے جانے کا اعلان کر دیا گیا تھا، جس سے ہمارے پہلے مضمون میں وضع کیا گیا ہمارا یہ کلیہ مزید موکد ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اُلْأَرْضُ کا استعمال عموماً بطور اسم جنس ہی ہوا ہے۔ مزید برآں موجودہ شمارے کے آخری فقرے وَجَعَلَ لَکُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ (اور اس نے زمینوں میں تمہارے لئے راستے بھی بنائے ہیں، تاکہ تم ہدایت پا سکو) پر تفصیلی گفتگو اسی مضمون میں کچھ آگے کی جائے گی، جس سے ہماری موجودہ مراد پر افزوں روشنی بھی پڑ سکے گی۔ اس طرح اگر سابقہ شمارہ کفار و منکرین کو بکثرت ٹھکانے فراہم کئے جانے کے بیان کے لئے مخصوص تھا تو موجودہ شمارہ اس تعلق سے منکرین و مومنین دونوں کے لئے بھی عام ہے۔

اب اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا (جس نے زمینوں کو تمہارے لئے بچھونا بنایا ہے) پر دوبارہ غور کیا جائے۔ یہ قرآنی فقرہ موجودہ نوع انسانی سے عمومی طور پر مخاطب ہو کر نہایت واضح تعبیر کے ذریعے یہ اعلان کر رہا ہے کہ ساتوں آسمانوں میں موجود ساری ہی زمینوں کو اس کے لئے بچھونا اور ٹھکانا بنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تمام زمینوں میں بھی اسے بکثرت زندگیاں عطا کر کے آزمایا جائے گا۔ چنانچہ اب حسب ذیل مزید آٹھ الگ الگ اور مختلف النوع ارشادات ربانی بھی ملاحظہ ہوں، جن کی بدولت یہ مفہوم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے گا:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ — وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق

فِیْ سِتَّةِ أَیَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ أَیُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا، وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْآ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (ہود:۷)

چھ دن میں اس وقت کی جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے تم میں سب سے اچھا کون ہے۔ اب اگر آپ ان سے کہیں کہ مرنے کے بعد تمہیں اٹھایا جائے گا تو کفار کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

الفاظ قرآنی سے بالکل عیاں ہے کہ یہاں بھی خطاب عمومی طور پر اس زمین کے سارے ہی انسانوں سے ہے۔ نیز السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ کی ترکیب سے پتہ چل رہا ہے کہ اس سے مراد ساتوں آسمان اور ان میں موجود ساری زمینیں ہیں۔ اس مفہوم کی مزید تاکید چھ دنوں کی تخلیق سے بھی ہو رہی ہے، جیسا کہ ہمارے پہلے مضمون میں مدلل طور پر گفتگو ہو چکی ہے کہ باری تعالیٰ نے جس کی تخلیق میں پورے چھ دن لگائے اس میں کل مظاہر فطرت شامل ہیں۔ لہٰذا ان سب کی تخلیق کی غرض وغایت ہی لِیَبْلُوَكُمْ (تا کہ وہ تمہیں آزمائے) بتائی جا رہی ہے، جس سے منصوص طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کی ساری زمینیں ہماری ابتلا و آزمائش ہی کی خاطر پیدا کی گئی ہیں۔ اسی لئے اس اعلان کے معاً بعد کفار کے عدم بعثت کے قول پر نہایت تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ خدائی حکمت ومنصوبہ بندی کے تحت جب ان کے لئے اتنی ساری زندگیاں مقدر کی جا چکی ہیں، اور ان میں سے کچھ کو یہ بتا بھی چکے ہیں تو اب یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس موت کے بعد انہیں پھر سے نہیں اٹھایا جائے گا۔ یعنی یہاں کفار کی جانب سے موت کے بعد از سر نو حیات کی تکذیب کا جواب خود ان کی کثرت تخلیق سے دیا جا رہا ہے۔ اس طرح قرآن مجید بعثت کے منکرین کا رد کبھی ان کے سابق میں عدم سے وجود میں لائے جانے کے ذریعے کرتا ہے تو کبھی خود ان کی کثرت تخلیق کے ذریعے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ، إِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَآیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ:۱۳)

آسمانوں اور ساری زمینوں میں جو کچھ بھی ہے انہیں اس نے اپنی جانب سے تمہارے تابع کر دیا ہے، بے شک اس میں فکر کرنے والوں

کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

اس آیت میں بھی خطاب اس زمین کے سارے انسانوں سے عمومی نوعیت ہی کا ہے۔ نیز السَّمٰوٰتُ کے پس منظر میں اَلْأَرْضُ خبر دے رہا ہے کہ یہاں بھی اس کا وقوع بطور اسم جنس ہی ہو رہا ہے۔ پھر یہاں ٹھیک شمارہ نمبر ایک ہی کے مطابق اس کی تاکید جَمِیْعًا لاکر اس میں مزید تاکید پیدا کی جا رہی ہے کہ اس سے کائنات کی ساری ہی زمینیں مراد ہیں۔ لہذا یہ آیت کریمہ بھی منصوص طور پر یہ اعلان کر رہی ہے کہ ان ساری زمینوں کو موجودہ انسان کے تابع اور اس کا خادم بنا دیا گیا ہے، جس سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ شمارہ پچھلے شمارے کی وضاحت کرنے والا ہے کہ سارے آسمانوں اور ان میں موجود زمینوں کو اس کی آزمائش کی خاطر پیدا کئے جانے کا کیا مطلب ہے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ، وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ، وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهٖ، إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ أَحْيَاكُمْ، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلٰى رَبِّكَ، إِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ۔ وَإِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ

آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی بھی ہے وہ سب اسی کا ہے، اور بے شک اللہ ہی بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمینوں کی ساری چیزوں کو اور ان کشتیوں کو بھی تمہارے تابع کر دیا ہے جو سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہیں، اور آسمانوں کو بھی تھامے ہوئے ہے کہ وہ اس کے حکم کے بغیر زمینوں پر نہ گریں، بے شک اللہ لوگوں پر بڑا نرم اور نہایت مہربان ہے۔ وہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا، پھر موت دے گا، پھر زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ناشکرا ہے۔ ہر امت کے لئے ہم نے ایک جگہ مقرر کی ہے جس سے وہ مانوس ہیں، سو وہ اس معاملے میں آپ سے نہ جھگڑیں، آپ اپنے رب کی جانب

بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُوْنَ. أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ، إِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ، إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ

(حج: ۶۴-۷۰)

دعوت پیش کیجئے، بے شک آپ سیدھے راستے ہی پر قائم ہیں۔ اور اگر وہ آپ سے جھگڑیں تو ان سے کہہ دیجئے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اسے اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے، اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان اس چیز میں فیصلہ کرے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہر کسی کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے، بے شک یہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے، یقیناً یہ اللہ کے لئے بڑا آسان ہے۔

اس شمارے کی ساتوں آیات بھی باہم ایک دوسرے سے منظم طور پر مربوط ہیں۔ چنانچہ ابتدا ہی میں مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ کی ترکیب بتا رہی ہے کہ یہاں بھی ساتوں آسمانوں کی ساری زمینیں مراد ہیں۔ اب ملاحظہ ہو کہ جس طرح پچھلے شمارے میں سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (آسمانوں اور ساری زمینوں میں جو کچھ بھی ہے انہیں اس نے اپنی جانب سے تمہارے تابع کر دیا ہے) کے ذریعے راست طور پر ساری آسمانی زمینوں کو ہمارے تابع و خادم بنا دیے جانے کی خبر دی گئی تھی موجودہ شمارے میں یہی خبر بالواسطہ طور پر پہلے الْأَرْضُ کی جنسیت پر دلیل قائم کرنے کے بعد سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ (زمینوں کی ساری چیزوں کو تمہارے تابع کر دیا ہے) کے ذریعے دی جا رہی ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کو مزید تقویت پہنچانے ہی کے لئے اگلی آیت میں وَهُوَ الَّذِيْٓ أَحْيَاكُمْ، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (وہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں موت دے گا، پھر زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ناشکرا ہے) کے ذریعے ان تمام آسمانی زمینوں میں سے کچھ میں سابق میں بتائی گئی اور مستقبل میں بھی بتائی جانے والی ہماری مختلف زندگیوں کی خبر دی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ اس آیت پر مفصل کلام ہم شمارہ ۲ کے تحت کر چکے ہیں۔ پھر اگلی آیت میں بھی لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ (ہر امت کے لئے ہم نے ایک جگہ مقرر کی

ہے جس سے وہ مانوس ہیں) کے ذریعے ساری زمینوں میں تعدد تخلیق کی غرض سے بکھیری اور پھیلائی گئی انسانی نسلوں ہی کا سبق دیا جارہا ہے۔ ملحوظ رہے کہ مَـنْسَکٌ کے حقیقی معنے ''مانوس جگہ'' ہوتے ہیں، اور اس آیت کی تفسیر میں یہی معنے خود متقدمین سے بھی مروی ہیں۔ لہٰذا اس سے مراد زمینیں ہی ٹھہرتی ہیں۔ اسی لئے اس کے معاً بعد رسول اللہؐ کے توسط سے امت مسلمہ کو اس ضمن میں اختلاف کرنے والوں اور جھگڑنے والوں سے نہ الجھنے کی تلقین کرتے ہوئے أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰـهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ (کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے) کے ذریعے بطور حیرت واستعجاب سوال کیا جارہا ہے کہ کیا باری تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کی ان ساری غیبی باتوں کی خبر ان سب پر محیط اپنے علم ازلی کی بنیاد ہی پر نہیں دے رہا ہے۔ پھر إِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ (بے شک یہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے) خبر دے رہا ہے کہ اس کی متعلقہ ساری جزئیات وتفصیلات کتاب الٰہی میں مرقوم بھی ہیں۔

إِنَّ اللّٰـهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، إِنَّهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ، فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ، وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا، وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا۔ قُلْ أَرَءَيْتُمْ شُرَكَآئَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، أَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ، أَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ، بَلْ إِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُوْرًا۔ إِنَّ اللّٰهَ

بے شک اللہ آسمانوں اور زمینوں کے غیب جاننے والا ہے، یقیناً وہ سینوں کے بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔ وہی ہے جس نے تمہیں زمینوں کے خلیفے بنایا ہے، سو جو کوئی کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا، اور کفار کا کفران کے رب کے ہاں ناراضگی ہی بڑھاتا ہے، اور کفار کا کفر خسارے ہی کو زیادہ کرتا ہے۔ آپ ان سے کہئے ذرا بتاؤ تو سہی اللہ کے ماسوا تم اپنے جن معبودوں کو پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے کون سی زمین پیدا کی ہے، یا آسمانوں ہی میں ان کی کون سی حصہ داری ہے، یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دے رکھی ہے کہ وہ اس کے واضح دلائل پر قائم ہیں؟ بلکہ یہ ظالم آپس میں

يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا، وَلَئِنْ زَالَتَآ إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ، إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (فاطر:۳۸-۴۱)

ایک دوسرے سے محض دھوکہ کا وعدہ کرتے آرہے ہیں۔ بے شک اللہ آسمانوں اور زمینوں کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ کہیں ٹل نہ جائیں، اور اگر وہ ٹل بھی جائیں تو انہیں اللہ کے علاوہ کوئی اور تھام بھی نہیں سکتا ہے۔ بے شک وہ بڑا بردبار بہت معاف کرنے والا ہے۔

اس شمارے کی ساری آیات بھی اپنی مراد میں نہایت مربوط ومنضبط ہیں۔ چنانچہ پچھلے شمارات ہی کی طرح ایک اور مرتبہ یہاں بھی السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ دہرا کر یہ معنویت پیدا کی جارہی ہے کہ اس سے سارے آسمان اور ساری زمینیں مراد ہیں۔ نیز اس شمارے کے وسط میں اور بالکل آخر میں بھی یہ ترکیب دو اور مرتبہ دہرا کر اس استدلال کو مزید مستحکم کیا جارہا ہے۔ اب زمینوں کی جنسیت پر دلالت کرنے والے اس سیاق وسباق کے بیچوں بیچ واقع ہونے والا فقرہ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ (وہی ہے جس نے تمہیں زمینوں کے خلیفے بنایا ہے) نہایت واضح طور پر خبر دے رہا ہے کہ یکے بعد دیگرے ان ساری زمینوں میں بھی ہمیں خلیفہ بنایا جانے والا ہے۔ اس طرح یہ فقرہ پچھلے تینوں شمارات میں ساری زمینوں کو ہماری آزمائش کے لئے پیدا کئے جانے اور انہیں ہمارے تابع بنادئے جانے کا مزید کیا مطلب ہوسکتا ہے اس کی بھی توضیح کرنے والا ہوجاتا ہے۔ اسی لئے اگلی ہی آیت میں قُلْ أَرَئَيْتُمْ شُرَكَآئَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، أَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (آپ ان سے کہئے ذرا بتاؤ تو سہی اللہ کے ماسوا تم اپنے جن معبودوں کو پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے کون سی زمین پیدا کی ہے، یا آسمانوں ہی میں ان کی کون سی حصہ داری ہے) کے ذریعے مشرکین سے سوال کیا جارہا ہے کہ کیا وہ اپنے شرک کی تائید میں ان ساری زمینوں میں سے کسی ایک بھی زمین کی تخلیق کو غیر اللہ کی جانب سے پیش کرسکتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے پہلے مضمون میں مذکور آیت احقاف: ۴ میں بھی بعینہ اسی طرح کی تعبیر لاکر زمینوں کی کثرت پر استدلال کیا گیا تھا۔

نیز سابقہ اور موجودہ دونوں شمارات کے درمیان تعبیری اتحاد بھی ملاحظہ ہو، جو ان کے معنوی اتحاد کی جانب معنی خیز اشارہ کرنے والا ہے۔ اگر سابقہ شمارے میں ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں کو ہمارے تابع و خادم بنادئے جانے کے اعلان کے بعد آخر میں أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ (کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے) کہا گیا تھا تو موجودہ شمارے کی ابتدا ہی میں یہ سبق إِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (بے شک اللہ آسمانوں اور زمینوں کے غیب جاننے والا ہے) کے ذریعے دیتے ہوئے ان ساری زمینوں میں اسے خلیفہ بنائے جانے کا اعلان کیا جارہا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِیْ الْأَرْضِ جَمِيْعًا، ثُمَّ اسْتَوٰٓى إِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ:۲۹)

وہی ہے جس نے ساری زمینوں میں جو کچھ بھی ہے سب تمہارے ہی لئے پیدا کیا، پھر آسمانوں کی جانب متوجہ ہوا اور انہیں (یعنی زمینوں کو) ساتوں آسمانوں میں استوار کردیا، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

یہ آیت پاک شمارہ نمبر ایک میں مذکور عمومی نوعیت کی آیت كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کے متصل بعد والی ہے، اور وہاں پیش کردہ انسان کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں کے دعوے کی دلیل کے طور پر لائی گئی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی الْأَرْضُ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس کی تاکید ایک اور مرتبہ جَمِيْعًا سے بھی کی جارہی ہے۔ لہذا یہاں بھی قربت کی وجہ سے اس تاکید کا موکد الْأَرْضُ ہونا واجب ہے۔ یاد رہے کہ ہمارے پہلے مضمون میں مذکور آیت زمر:۶۷ اور اوپر مذکور آیت جاثیہ:۱۳ میں اس طرح کی دو اور مثالیں بھی گزر چکی ہیں۔ نیز اس مفہوم کی مزید تاکید سَوّٰهُنَّ میں موجود ضمیر جمع مونث غائب سے بھی ہورہی ہے، جو الْأَرْضُ کے علاوہ کہیں اور لوٹ بھی نہیں سکتی ہے۔

اب ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ لفظی اور معنوی دونوں ہی اعتبارات سے موجودہ شمارے اور ہمارے پہلے مضمون میں مذکور آیات حم سجدہ:۹-۱۲ کے درمیان کس قدر یکسانیت ہے، اور یہ کہ یہ

دونوں شمارات باہم ایک دوسرے کے اجمال کی کس قدر شرح و تفصیل کرنے والے ہیں؟ دونوں جگہ تخلیق کائنات کے بیان کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک استوائے الٰہی سے قبل والا اور دوسرا اس کے بعد کا۔ پھر دونوں موقعوں پر آسمانوں کی جانب استوائے الٰہی سے قبل صرف زمینوں کی تخلیق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر سابقہ شمارے میں اُلْأَرْضُ کا ذکر بصیغۂ واحد کیا گیا تھا تو موجودہ شمارے میں اس کی تفسیر و تاکید جَمِيعًا کے ذریعے کرتے ہوئے یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ وہاں بھی اس کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے۔ پھر استوا کے بعد دونوں ہی مقامات پر کل آسمانوں اور کل زمینوں کے ضمن میں بصیغۂ واحد اور بطور اسم جنس جاری کلام کو اعجازی طور پر یک بہ یک صیغۂ جمع میں تبدیل کرتے ہوئے ساری زمینوں کو ساتوں آسمانوں میں درست واستوار کردئے جانے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں ان دونوں مقامات پر خطاب کے اسلوب میں مماثلت بھی کافی معنی خیز ہے: اگر سابقہ شمارے میں قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ کے ذریعے خطاب طبقۂ کفار سے کیا گیا تھا تو موجودہ شمارے میں بھی كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ کے ذریعے ٹھیک یہی طبقہ مخاطب ہے۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ خطاب میں کفار کی تخصیص صرف بطور تنبیہ اور تعجب ہے کہ جب ساری ہی زمینیں ان کی خاطر پیدا کی گئی ہیں تو وہ کفر کیسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ورنہ سابقہ شمارات ہی کے موافق یہاں بھی سارے ہی انسان مخاطب ہیں۔

اب جب کہ موجودہ آیت میں ساری ہی زمینوں کی تخلیق کی غرض وغایت لَكُمْ (تمہارے لئے) بیان کی گئی ہے تو اس سے بھی اور خود خطاب میں یکسانیت سے بھی لازم آتا ہے کہ سابقہ شمارے میں بھی ٹھیک یہی مقصود ہو، جہاں اسے معنی خیز طور پر محذوف و مقدر کر دیا گیا ہے۔ لَكُمْ کے استعمال میں یہ حکمت الٰہی بھی ملحوظ رہے کہ اس کا استعمال صرف وہیں کیا گیا ہے جہاں تعبیر میں ابہام کی زیادتی ہو، تاکہ معانی کے قبل از وقت ظہور پر وقتی روک لگائی جا سکے۔ لہٰذا اس آیت کریمہ سے بھی اور خود حم سجدہ: ۹-۱۲ کی روشنی میں بھی ایک اور مرتبہ بحسن وخوبی ثابت ہوتا ہے کہ ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں کی تخلیق خود ہماری آزمائش ہی کی خاطر کی گئی ہے۔ چنانچہ اب غور کیا جا سکتا ہے کہ شمارہ نمبر ایک کے تحت مذکور مبہم ارشاد باری کس قدر عظیم معانی کو

اپنے اندر نہایت خوبصورتی سے سموئے ہوئے ہے۔

وَمَآ أَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (عنکبوت:۲۲)	تم نہ زمینوں میں عاجز کرسکتے ہو اور نہ ہی آسمانوں میں، اور نہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست ہوگا یا مددگار۔

یہاں اُلْأَرْضُ کو السَّمَآءُ کے پس منظر میں استعمال کیا گیا ہے، جس سے ہماری سابقہ توجیہ کے مطابق پتہ چل رہا ہے کہ یہاں بھی یہ دونوں بطور اسم جنس ہی واقع ہورہے ہیں۔ لہٰذا اس ترکیب سے ساتوں آسمان اور ان میں موجود ساری ہی زمینیں مراد ہوئیں۔ نیز موجودہ فقرے وَمَآ أَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ اور شمارہ ۱۶ میں مذکور فقرے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا میں تعبیر کی یکسانیت بھی ملحوظ رہے، جس سے ہمارا استدلال مزید مضبوط و موکد ہوجاتا ہے، اور اُلْأَرْضُ اور السَّمَآءُ کی جنسیت کے تعلق سے وضع کردہ ہمارا سابقہ کلیہ بھی اور زیادہ تقویت حاصل کرجاتا ہے۔ لہٰذا جس طرح مسلسل پچھلے پانچ ارشادات کے ذریعے ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود ساری ہی زمینوں کو ہماری آزمائش کے لئے پیدا کیا جانا، ان سب کو ہمارے تابع اور خادم بنا دیا جانا، ان میں ہمیں بطور خلیفہ پیدا کیا جانا اور انہیں ہماری خاطر پیدا کیا جانا مذکور ہوا تھا موجودہ ارشاد بالکل واضح الفاظ میں ہمیں ان سب میں بھی خلعت وجود سے نوازا جانا تسلیم کررہا ہے۔ چنانچہ اس سے بھی ناقابل تردید طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں کثرت سے ٹھکانے فراہم کیے جانے اور زمینوں کو ہمارے لئے بچھونے اور ٹھکانے بنا دئے جانے کا مطلب ہمیں ان میں زندگیاں عطا کیا جانا ہی ہے۔ اب اگلی آیات ملاحظہ ہوں، جو ٹھیک یہی حقیقت ایک دیگر پیرایہ بیان میں ادا کرنے والی ہیں:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا، وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ. الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا،	بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ساری سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت وحیات کو تمہاری آزمائش کی خاطر پیدا کیا ہے کہ تم میں سب سے اچھا عمل کس کا ہے اور وہ بڑا زبردست اور بہت معاف کرنے

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ، فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ

(ملک:۱-۶)

والا ہے۔ جس نے سات آسمان طبق در طبق پیدا کئے ہیں، تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی اختلاف نہیں دیکھے گا، تو اپنی نگاہ کو دوبارہ لوٹا، کیا تجھے کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر نگاہ کو بار بار لوٹا اور وہ تھکی ماندی اور نامراد ہو کر تیری جانب لوٹ آئے گی اور ہم نے قریبی آسمان کو کچھ چراغوں سے آراستہ کر رکھا ہے، اور انہیں شیطانوں کو مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے اور ہم نے ان کے لئے بھڑکتی آگ کا عذاب بھی تیار کر رکھا ہے اور جو اپنے رب کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور وہ برا مقام ہے۔

جیسا کہ ہم نے اپنے تیسرے مضمون میں مذکور آیات ملک:۱۶-۲۰ کے تحت عرض کیا تھا سورۂ ملک واقعی اسم بامسمّی ہے، جس میں ساتوں آسمانوں پر محیط خدائی سلطنت اور اس میں جاری ونافذ پورے فلسفۂ تخلیق وتخریب کو ایک اچھوتے اور اعجازی انداز میں سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ جس طرح وہاں مذکور اس سورت کے نصف آخر میں آسمانوں میں موجود زمینوں کی کثرت اموات وحیات کا روح فرسا ورقت آمیز بیان تھا ٹھیک اسی طرح یہاں بھی اس کے نصف اول میں اس تعدد اموات وحیات کا ذکر خود انسان کے پس منظر میں ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہاں پہلی آیت میں ساری سلطنت قادر مطلق اللہ کی ذات کے لئے مخصوص قرار دینے کے فوراً بعد دوسری آیت میں الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا کے ذریعے نوع انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے موت وحیات کی تخلیق کا مقصد ہی اس کی ابتلا وآزمائش قرار دیا جا رہا ہے کہ ان میں سب سے اچھا عمل کن مومنین کا ہوگا۔ پھر چھٹی آیت میں وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ کے ذریعے اس کے دوسرے گروہ کفار کے لئے جہنم کے عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے۔ اس طرح ان کی درمیانی تیسری تا پانچویں تین آیات جملہ معترضہ ٹھہرتی ہیں۔ اب غور

کا مقام ہے کہ مومنین اور کفار کی تخلیق و آزمائش کے اس مربوط بیان کے عین وسط میں بطور جملہ معترضہ طبق در طبق سات آسمانوں کی بھی بے عیب تخلیق کے بیان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ یہ سوال اس وقت اور زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب انسان کی ابتلا و آزمائش کا ذکر ساتوں آسمانوں پر محیط خود خدائی سلطنت و بادشاہت کے ذکر کے معاً بعد کیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں معنی خیز طور پر خلاف قاعدہ موت کا ذکر پہلے اور حیات کا ذکر بعد میں کرتے ہوئے باری تعالیٰ کی دو نہایت عظیم القدر صفات الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (بڑا زبردست اور بہت معاف کرنے والا) لا کر اس کے متصل بعد سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ لہذا اس سے بہت ہی واضح اور نہایت بلیغ اشارہ ملتا ہے[۱] کہ موت و حیات کا یہ بیان کسی بھی طرح خلاف قاعدہ نہیں بلکہ انسان کو یہ باور کرانے کے لئے قصداً لایا گیا ہے کہ اس میدان ابتلا و آزمائش میں اسے موت کے بعد دنیا ہی میں دوبارہ حیات سے نوازا جائے گا، اور اس سلسلۂ آزمائش کو ساتوں آسمانوں میں بھی بار بار دہرایا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفات عزیزیت و غفاریت ہی کی بنیاد پر ہوگا، کیوں کہ اگر انسان کو ساتوں آسمانوں کی ساری ہی زمینوں میں آزمایا جاتا ہے تو وہ ذات الٰہی کی صفت عزیزیت کی وجہ ہی سے ممکن ہوتا ہے، جب کہ اس کی کثرت تخلیق کے ذریعے اس کے اہل کفر طبقے کے گناہوں کو ہر مرتبہ نظر انداز کرتے ہوئے اسے ایمان و ایقان کے بار بار مواقع فراہم کرنا اس کی صفت غفاریت کا غماز ہوتا ہے۔

اب موجودہ شمارے اور شمارہ ۱۵ کے درمیان معنی خیز لفظی اور تعبیری مشابہت بھی ملحوظ رہے۔ دونوں جگہ انسان کی آزمائش کے لئے لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا کا یکساں بیان ہے۔ پھر اس میدان آزمائش کی تعیین و تصریح اگر وہاں وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ کے ذریعے کرتے ہوئے حیات بعد الموت کا انکار کرنے والوں پر انتہائی حیرت کا اظہار کیا گیا تھا تو یہاں بھی یہی تصریح الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا کے ذریعے کرتے ہوئے موت کے بعد حیات کا مثبت سبق دیا جا رہا ہے۔ لہذا اس

۱؎ یہ "بلیغ اشارہ" خاص طور سے مطالعہ کے احتیاط کا مستحق ہے کہ اس سے بعض گمراہ عقائد کی تائید ہوتی نظر آتی ہے اور محض اشاروں کی بلاغت سے جمہور کے عقائد کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ (معارف)

سے بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں شمارات ایک ہی حقیقت کا بیان ہے۔ یہ مفہوم حسب ذیل آیت سے مزید موکد ہو جاتا ہے، جہاں انسان کو سارے آسمانوں اور زمینوں سے رزق عطا کیا جانا مذکور ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، قُلِ اللّٰهُ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (سبا:۲۴)	آپ پوچھئے کہ تمہیں آسمانوں اور زمینوں سے رزق کون دیتا ہے؟ کہئے کہ اللہ ہی (دیتا ہے) اور یقیناً ہم یا تم ہدایت پر یا صریح گمراہی میں ہیں۔

چنانچہ اب اگر اس زمین کی موجودہ نسل انسانی کی پیدائش و آزمائش ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں میں بھی کی جاتی ہے تو ٹھیک اسی منطق سے یہ حقیقت دیگر ساری زمینوں میں بسائی گئی ساری انسانی نسلوں پر بھی صادق آتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شمارات ۵-۷ کائنات کی ساری زمینوں میں بسائی گئی نسلوں کے لئے بھی عام ہیں۔

اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل ہم اس جدید فلسفۂ تعدد تخلیق انسانی کے ایک مرکزی واساسی اور نہایت حساس مسئلے کو حل کرتے چلیں۔ احقر راقم سطور کو اس بات کا کامل اور ذمہ دارانہ احساس ہے کہ یہ فلسفۂ کائنات اس وقت تک پائے تکمیل کو نہیں پہنچ سکے گا جب تک کہ اس میں ابو البشر سیدنا آدم علیہ الصلوۃ والسلام کی حقیقی نوعیت اور ان کے مقام و مرتبے کی ٹھیک ٹھیک تعیین نہ ہو۔ لہذا جب پچھلے مسلسل بائیس ارشادات ربانی سے نہایت واضح الفاظ میں اور مختلف النوع طرق واسالیب کے ذریعے منصوص طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود ساری زمینوں کی تخلیق اولاد آدمؑ کی ابتلا و آزمائش ہی کی خاطر کی گئی ہے اور یہ کہ ان میں ان کی پیدائش بار بار ہو رہی ہے تو حضرت آدمؑ کی خلافت بھی خود بخود اور بالواسطہ طور پر ان سب پر محیط ہو جاتی ہے، مگر ان سارے دلائل وشواہد سے قطع نظر ہم چاہتے ہیں کہ یہ حقیقت بھی قرآن حکیم ہی کے ذریعے براہ راست اور بذات خود آپؑ ہی کے تعلق سے ثابت ہو جائے، اور اس ضمن میں شک و تردد کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ خلافت آدمؑ کی حقیقت و نوعیت کو کتاب الٰہی اپنی ابتدا ہی میں اس طرح بیان کرتی ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْأَرْضِ جَمِیْعًا، ثُمَّ اسْتَوٰی إِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِیْفَةً، قَالُوْٓا أَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ، وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ، قَالَ إِنِّیْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْۢبِئُوْنِیْ بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ. قَالَ یٰٓاٰدَمُ أَنْۢبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ، فَلَمَّآ أَنْۢبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّیْٓ أَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ

(بقرہ:۲۹-۳۳)

وہی ہے جس نے ساری زمینوں میں جو کچھ بھی ہے سب تمہارے ہی لئے پیدا کیا، پھر آسمانوں کی جانب متوجہ ہوا اور انہیں (یعنی زمینوں کو) ساتوں آسمانوں میں استوار کر دیا، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اور جب آپ کے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمینوں میں ایک خلیفہ بنانے جا رہا ہوں، انہوں نے کہا کہ کیا تو ان میں اسے خلیفہ بنائے گا جو فساد برپا کرے گا اور خون خرابہ کرے گا، جب کہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اس نے فرمایا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ پھر اس نے آدم کو سارے ہی ناموں کا علم عطا کیا، پھر انہیں ملائکہ کے آگے پیش کر کے فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتا دو۔ انہوں نے کہا کہ تو پاک ہے، ہمیں صرف اتنا ہی علم حاصل ہے جتنا کہ تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو ہی بڑے علم و حکمت والا ہے۔ اس نے فرمایا اے آدم انہیں ان کے نام بتا دو، پھر جب آدم نے انہیں ان کے نام بتا دیئے تو اس نے فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں سارے آسمانوں اور زمینوں کے غیب کا علم رکھتا ہوں اور یہ کہ تم جو کچھ ظاہر کر رہے ہو اور جو کچھ ظاہر نہیں بھی کر رہے ہو میں سب

جانتا ہوں؟

نوع انسانی کے مورث اعلی حضرت آدمؑ اور ان کی خلافت کا تعارف وتذکرہ قرآن مجید میں پہلی مرتبہ ان ہی آیات میں آیا ہے۔ یہ ساری آیات معنوی اعتبار سے باہم حد درجہ مربوط ومنضبط ہیں۔ جیسا کہ شمارہ نمبر ایک کے تحت عرض کیا جا چکا ان آیات کا بیان وہاں مذکور دعوے كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَكُنۡتُمۡ أَمۡوَاتًا فَأَحۡيَاكُمۡ، ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ثُمَّ إِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ کے ثبوت میں ہو رہا ہے کہ انسان اپنی موجودہ زندگی سے پہلے بھی زندہ رہ کر موت سے دوچار ہوا تھا، اور یہ کہ اس کے بعد بھی اسے پھر سے پیدا کر کے آزمایا جائے گا۔ چنانچہ اس دعوے کی متصل اگلی یعنی یہاں مذکور پہلی آیت میں اس کا ثبوت یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ ساتوں آسمانوں کی ساری ہی زمینوں کو خود اس کی آزمائش کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ یاد رہے جیسا کہ ابھی شمارہ ۱۹ کے تحت ثابت کیا جا چکا اس آیت میں الۡأَرۡضُ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس کی تاکید جَمِيۡعًا کے ذریعے کرنے کے بعد سَوّٰهُنَّ میں موجود ضمیر جمع مونث غائب کو بھی اسی کی جانب لوٹایا گیا ہے۔ لہذا جب تسلسل کے ساتھ متصل ماقبل آیت میں نوع انسانی کے ضمن میں اس کا وقوع اسم جنس کے طور پر ہو رہا ہے تو نظم کلام اور عقل ومنطق دونوں ہی اعتبارات سے لازم آتا ہے کہ خود اسی کے مورث اعلی کی تخلیق وخلافت کا سبق دینے والی اس سے حد درجہ مربوط اگلی آیت وَإِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلَآئِكَةِ إِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡأَرۡضِ خَلِيۡفَةً (اور جب آپ کے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمینوں میں ایک خلیفہ بنانے جا رہا ہوں) میں بھی اس کا استعمال اسی معنے میں ہو، اور بغیر کسی عقلی یا نقلی دلیل کے اس نظم میں انحراف پیدا نہیں کیا جائے۔ لہذا اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ ان آیات میں خلافت آدمؑ کا تذکرہ کائنات کی ساری ہی زمینوں کے سیاق میں ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت آدمؑ کو سارے ہی ناموں کا علم عطا کیا جانا بھی نہایت معنی خیز ہے، کیوں کہ بغیر کسی تحدید کے الۡأَسۡمَآءَ كُلَّهَا سے مراد جس قدر بھی نام ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور جب ساتوں آسمانوں کے پس منظر میں اس کا استعمال کیا جائے تو اس مفہوم میں مزید تاکید پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا اس سے بھی صریح اشارہ مل رہا ہے کہ آپؑ کو سارے

ہی موجودات کے علم سے آراستہ وپیراستہ کر کے ساتوں آسمانوں میں موجود زمینوں کی خلافت کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

اب ملاحظہ ہو کہ یہاں پہلی آیت میں بطور اسم جنس ساری زمینوں کو ساتوں آسمانوں میں استوار کر دئے جانے کے بیان کے بعد درمیان میں ان ساری زمینوں پر بصیغۂ واحد اَلْأَرْض سے جو استدلال کیا گیا تھا اب آخر میں اچانک اعجازی طور پر تعبیر میں تبدیلی لاکر ساری ہی زمینوں پر دلالت کرنے والی ترکیب السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ کا استعمال کرتے ہوئے ملائکہ کی جانب سے خلیفے کی پیدائش پر کئے گئے اعتراض کے لئے انہیں أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں سارے آسمانوں اور زمینوں کے غیب کا علم رکھتا ہوں) کے ذریعے تنبیہ کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس سے بھی بخوبی مترشح ہوتا ہے کہ اس پورے شمارے میں کلام منظم طور پر ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود ساری زمینوں کے سیاق ہی میں ہو رہا ہے۔ لہذا اس طور سے بھی حضرت آدمؑ کی خلافت کا ان سب پر محیط ہونا منصوص طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ فی الواقع یہ فقرہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملائکہ کو فرمائے گئے فقرے قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ کے اجمال کی تفصیل ہے۔ چنانچہ بلا تکلف ان دونوں اجمالی اور تفصیلی فقرات کا باہم تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ لہذا یہاں تقدیر کلام یوں ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً، قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ، وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ، قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (جب آپ کے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمینوں میں ایک خلیفہ کو بنانے جا رہا ہوں، انہوں نے کہا کہ کیا تو ان میں اسے خلیفہ بنائے گا جو فساد برپا کرے گا اور خون خرابہ کرے گا، جب کہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اس نے فرمایا کہ میں سارے آسمانوں اور زمینوں کے غیب کا علم رکھتا ہوں)۔ اب ظاہر ہے کہ ملائکہ کی جانب سے اعتراض اگر حضرت آدمؑ کی صرف ایک ہی زمین کی خلافت پر ہوتا تو اس کے جواب میں باری تعالیٰ ان سے ساری ہی کائناتی زمینوں کے امور غیب کی بات نہ کرتا۔ چنانچہ اس وسیع وعریض اور آفاقی وکائناتی خلافت کے قیام کے لئے کیا طریقہ کار اپنایا گیا اور

اس کے انتظام وانصرام کے لئے مزید کیا کیا اقدامات کئے گئے اس کی تفصیل کے لئے اگلے تین شمارات بھی ملاحظہ ہوں:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ، أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ، قَالُوْا بَلٰى، شَهِدْنَا، أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (اعراف:۱۷۲)	جب آپ کے رب نے آدم کے بیٹوں کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر شہادت لی کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، ہم شہادت دیتے ہیں۔ (ہم نے یہ شہادت اس لئے لی) تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔

یہاں مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ، مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ سے بدل بعض ہے۔ جب کہ (ذُرِّيَّةٌ) کے معنے نسل کے آتے ہیں، جس کا استعمال واحد اور جمع دونوں کے لئے بھی ہوتا ہے۔ نیز اس کی ایک اور قرأت خود بصیغہء جمع ''ذُرِّيّٰتٌ'' بھی منقول ہوئی ہے۔ مزید برآں حضرت آدمؑ کے الگ الگ بیٹوں کی پیٹھوں سے جو ذریت نکلے وہ کسی بھی طرح واحد نہیں، بلکہ صرف جمع ہی ہو سکتی ہے۔ لہذا اس آیت پاک کے ذریعے حقیقی طور پر خبر دی جارہی ہے کہ میثاق کے وقت حضرت آدمؑ کی پیٹھ سے ان کی ایک نسل نہیں بلکہ آپؑ کے مختلف بیٹوں کی پیٹھوں سے ان کی الگ الگ نسلوں کو نکالا گیا تھا۔ اب یہ ایک بدیہی حقیقت ہوگی کہ آدمؑ کے بیٹوں کی پیٹھوں سے نکالی گئی ان ساری نسلوں کا شمار خود آپؑ کی اولاد ہی میں ہوگا۔ اس طرح یہاں نوع انسانی کی ابتداو آفرینش اول کو دو مراحل میں تقسیم کیا جارہا ہے: پہلے مرحلے میں حضرت آدمؑ سے ان کے بیٹوں کو نکالا گیا، پھر دوسرے میں ان بیٹوں سے ان کی نسلوں کو۔ لہذا ان ساری نسلوں میں سے ہر ایک نسل کا ایک علاحدہ مورث ثابت ہوتا ہے، اور حضرت آدمؑ ان سارے مورثوں کے جد امجد اور مورث اعلی ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نہایت واضح اور منصوص مطلب یہ ہوا کہ حضرت آدمؑ سے متعدد نسلوں کو خود ان کی آفاقی وکائناتی خلافت کے پیش نظر نکالا گیا تھا، تاکہ انہیں ساتوں آسمانوں میں موجود ساری زمینوں اور ان زمینوں کے ہر ایک حیاتی دور میں یکے بعد دیگرے بسایا جاسکے۔ نیز اس

عظیم منصوبہ بندی میں زندگیوں کا تعدد بھی شامل ہوجاتا ہے کہ ہر انسان کو کس کس کی ذریت وموروثیت میں پیدا کیا جائے، اور کس کس کو کس کس کا مورث۔

اس وقت یہ واضح کردینا بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ عہد الست کا یہ واقعہ قدیم کلامی دور میں متکلمین اسلام اور معقولیت پسند معتزلہ کے درمیان نہایت سنگین نزاعی مسئلہ بنا ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس قدر اہمیت اور عواقب ونتائج کا حامل واقعہ ہمیں اس دنیا میں یاد کیوں نہیں ہے؟ لہذا جو چیز ہمیں یاد نہیں معتزلہ اس کے سختی سے منکر تھے، سوانہوں نے اس عہد کو محض تمثیل قرار دیتے ہوئے اس کے وقوع ہی کا انکار کرڈالا۔ نیز اس زمانے میں تناسخ ارواح کا اجنبی تخیل بھی اسلامی حلقوں میں کافی حد تک سرایت کرآیا تھا۔ اس کی تردید میں متکلمین اسلام کی دلیل یہ تھی کہ اگر ہماری ارواح اس سے قبل دیگر اجسام میں ہوتیں تو اس وقت ہم پر بیتے ہوئے واقعات ہمیں اس زندگی میں بھی یاد ہوتے۔ لہذا انہوں نے اس نظریہ کی پرزور مخالفت کی۔ اس پر معتزلہ نے انہیں پھر سے اکسایا کہ تناسخ ارواح کے رد میں ان کی دلیل اگر یہی ہے تو ٹھیک اسی بنیاد پر وہ عہد الست کے اقرار سے بھی دست بردار ہوجائیں۔ اس پر متکلمین تقریباً لاجواب ہوگئے، اور نتیجتاً انہیں یہ نہایت دفاعی اور کمزور موقف اختیار کرنا پڑا کہ عہد الست کا وقوع ایک معمولی وقفے ہی کے لئے جاری رہا تھا، اس لئے وہ ہمیں یاد نہیں ہے، جب کہ تناسخ ارواح کی صورت میں مسلسل ایک مدت مدید تک مرتب ہونے والے واقعات ہمارے شعور وحافظے سے کسی بھی حالت میں محو نہیں ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اس تعلق سے خصوصیت کے ساتھ تفسیر کبیر کے مباحث ملاحظہ ہوں، جس سے اس موضوع کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

مگر یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ عہد الست کا واقعہ ہمیں یاد رہے بھی کیوں؟ غور کیا جاسکتا ہے کہ اگر دنیوی زندگی میں بھی وہ ہمارے حافظے کے افق پر برقرار رہتا تو آخر ایمان بالغیب کے کیا معنے رہ جاتے؟ منکرین ومکذبین کے سارے جھگڑے کا محور ہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی نہیں ہوسکتی ہے اور یہ کہ انسان بغیر کسی خارجی مداخلت کے از خود اس دنیا میں ظہور پذیر ہوا ہے اور مرنے کے بعد سڑ گل کر نیست ونابود ہوجائے گا۔ باری تعالیٰ سے کیا ہوا عہد وپیمان اگر ہمیں اس زندگی میں بھی یاد ہوتا تو کیا تاریخ انسانیت میں اخروی زندگی کا کوئی

ایک بھی منکر ہوتا، یا اسلام کے علاوہ کوئی اور بھی مذہب منصۂ وجود پر آتا؟ اس صورت میں ہر انسان مومن ہی ہوتا، اور ابتلا و آزمائش، ایمان ویقین، کفر وانکار وغیرہ اصطلاحات اپنی معنویت ہر طرح سے کھو جاتے۔ چنانچہ حسب ذیل ارشاد الٰہی بھی اس نقطۂ نظر کو مزید جلا بخشنے والا ہے:

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ، وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (انعام: ۲۷-۲۸)	اگر آپ ان کو اس وقت دیکھیں جب وہ دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے، اور وہ کہیں گے کاش ہمیں واپس لوٹا دیا جائے، اور ہم اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہو جائیں، بلکہ ان پر اس کا ظہور ہو کر رہا جسے وہ اس سے قبل چھپایا کرتے تھے۔ اور اگر انہیں واپس لوٹا دیا جائے تب بھی وہ وہی کرنے لگیں گے جس سے وہ منع کئے گئے تھے، یقیناً وہ جھوٹے ہی ہیں۔

یہ آیات پاک اس وقت کی تصویر کشی کرنے والی ہیں جب آخرت میں مشرکین ومنکرین کو ان کے اعمال کے عوض جہنم کے دہانے پہنچا دیا گیا ہوتا ہے، اور وہ خود اپنے چشم بینا سے آگ کا نہ صرف مشاہدہ بلکہ اس کا کچھ مزہ بھی چکھ چکے ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی اس التجا پر کہ انہیں عمل کا ایک اور موقع ہی دے دیا جائے تاکہ وہ اس کی اصلاح کر سکیں اللہ تعالی کی جانب سے انہیں یہ جواب دیا جا رہا ہے کہ بالفرض انہیں دوزخ سے نکال کر ایک اور دنیوی زندگی عطا کر دی جائے تب بھی وہ وہی کریں گے جو اس سے قبل کر چکے ہیں! اب سوچا جا سکتا ہے کہ ان منکرین کو قیامت کے وہ احوال وکوائف اور جہنم کا تجربہ ومشاہدہ یاد ہوتا تو کیا وہ دنیا میں ایک اور مرتبہ واپسی کے بعد پھر سے کفر وتکذیب کی کسی بھی طرح جسارت وحماقت کرتے؟ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کو ایک زندگی کے احوال دوسری زندگی میں بغرض ابتلا وآزمائش بھلا دئے جاتے ہیں اور اس کے شعور کو تحت الشعور میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے ان سارے اگلے پچھلے احوال وکوائف کا علم اسے صرف یوم حشر ہی میں ہوتا ہے۔ درج ذیل

ارشادات باری ٹھیک اسی حقیقت کا اظہار منصوص طور پر کرنے والی ہیں:

يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ. بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ (قیامہ: ۱۳-۱۴)

اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ وہ (اس زندگی سے) پہلے کیا کر چکا ہے اور (اس زندگی کے) بعد کیا کرنے والا ہے۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر شاہد رہے گا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (طارق:۹)

جس دن سارے بھید ظاہر کئے جائیں گے۔

اس تعلق سے بے شمار مزید قرآنی ارشادات کو بھی ہم آگے خود ان کے اپنے مخصوص پس مناظر میں پیش کریں گے، جس سے یہ حقیقت مزید قوی و مستحکم ہو جائے گی۔

لہذا میثاق کے وقت جب حضرت آدمؑ کی ذریت میں متعدد انسانی نسلوں کو خود ان کی آفاقی و کائناتی خلافت کے پیش نظر نکالا گیا تھا تو اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ نسل انسانی کو بھی آپؑ کے کسی ایک ہی بیٹے اور مورث کی ذریت میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ٹھیک اس حقیقت کو بھی قرآن حکیم ایک دوسری جگہ منصوص طور پر اور نہایت دوٹوک الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ، إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ. إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ (انعام: ۱۳۳-۱۳۴)

آپ کا رب بے پرواہ اور صاحب رحمت ہے۔ وہ اگر چاہے تو تمہیں (یہاں سے) لے جائے گا اور تمہارے بعد وہ جسے چاہے (یہاں) خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ اس نے تمہیں (کہیں اور سے لاکر یہاں) ایک دوسری قوم کی ذریت میں پیدا کر چکا ہے۔ تم سے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا، اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے ہو۔

طرز کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں خطاب عمومی نوعیت کا ہے، جس سے ساری ہی نسل انسانی مراد ہے۔ اس کی مزید تائید و تقویت شمارات ۹-۱۰ سے بھی ہو رہی ہے، جہاں عین اسی

امکان کا اظہار أَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) کے ذریعے عمومی طور پر پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے اسے یہاں سے ختم کر کے یہاں کسی اور کو بسائے جانے کے لئے صراحت کے ساتھ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (وہ ایک نئی مخلوق لے آئے گا) اور وَيَأْتِ بِآخَرِينَ (وہ دوسروں کو لے آئے گا) کہا گیا تھا۔ حقیقتاً یہ اور اس طرح کی دیگر تعبیرات ''القرآن یفسر بعضہ بعضا'' (قرآن کا بعض حصہ بعض دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے) کی زندہ نظائر ہیں۔ لہذا یہاں پہلی آیت میں اللہ تعالی کی جانب سے نہایت واضح الفاظ اور صریح ترین تعبیر کے ذریعے اس احتمال کا اظہار کیا جارہا ہے کہ ہمیں ٹھیک اسی طرح یہاں سے کہیں اور لے جا کر کسی اور کو یہاں لے آکر بسایا جاسکتا ہے جس طرح اس سے قبل خود ہمیں کہیں اور سے لاکر یہاں کسی دوسری قوم کی ذریت میں پیدا کیا گیا تھا۔ پھر اگلی ہی آیت میں إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَمَآ أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ (تم سے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا، اور تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ہو) کے ذریعے کہا جارہا ہے کہ یہ صرف احتمال ہی نہیں ہے بلکہ وعدہ ہے جو ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچ کر رہے گا، اور یہ کہ ہم اللہ کو اس کی تکمیل سے روک کر اسے عاجز نہیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں قطعی طور پر اور منصوص طریقے سے ثابت ہو رہا ہے کہ ہمارے موجودہ سلسلۂ انسانیت کی ابتدا کسی دوسری قوم کی ذریت ہی سے ہوئی تھی۔ یعنی بلاواسطہ آدمؑ سے نہیں بلکہ بالواسطہ آدمؑ سے ہوئی ہے، جس کا سلسلہ بالآخر آپؑ ہی سے جاملتا ہے۔

نیز یہاں بذریعہ کَمَا تشبیہ سے پتہ چل رہا ہے کہ اس زمین کی سابقہ سلسلۂ انسانیت کو یہاں سے کہیں اور روانہ کر کے اس کی جگہ اور خود اس کی ذریت میں موجودہ سلسلے کو کہیں اور سے لاکر ایک نئے سرخیل اور مورث کے ذریعے چلایا جارہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ساری زمینوں میں بسائے جانے والے تمام سلسلے بنی آدم ہونے کی وجہ سے انسان ہی ہوں گے۔ مگر چونکہ ہر سلسلے کا ایک علاحدہ مورث ہوتا ہے اور عین ممکن ہے کہ ان کی دیگر جزئیات وتفصیلات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں اس لئے ان میں سے ہر ایک نئی مخلوق ہی کہلائے گا۔ مزید برآں یہاں ذُو الرَّحْمَةِ (صاحب رحمت) بھی ملحوظ رہے کہ باری تعالیٰ کی یہ عظیم صفت رحیمیت کس طرح انسان کی تعدد تخلیق کے بیان کے تقریباً ہر موقع سے مسلسل دہرائی جارہی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ إِبۡرٰهِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ. ذُرِّیَّۃً بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ، وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (آل عمران: ۳۳-۳۴)	یقیناً اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام عالموں پر منتخب فرمایا ہے، اس حال میں کہ وہ سب ایک دوسرے کی اولاد ہوتے ہیں، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

عَالَم اسم جمع ہے، جس کا واحد نہیں آتا ہے۔ اس کے معنے کل مخلوق کے ہوتے ہیں۔ خود متقدمین کے نزدیک بھی اس کے معنے ذات الٰہی کے ماسوا کل مخلوقات ہی کے رہے ہیں۔ البتہ اگر کل مخلوق کی ہر ہر نوع کو ایک الگ عالم مانا جائے تو اس کی جمع ''عَالَمُوْنَ'' آتی ہے۔ لہٰذا اس تعریف کی رو سے الۡعٰلَمِیۡنَ کے مفہوم میں ساتوں آسمان اور ان میں موجود ساری زمینیں اور دیگر سارے اجرام آجاتے ہیں۔ خود قرآن مجید ہی میں دیگر مقامات پر بھی اس کا استعمال اسی مفہوم و مدلول پر دلالت کرنے والا ہے:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (فاتحہ: ۱)	ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، جو تمام عالموں کا رب ہے۔

سورۂ فاتحہ قرآن حکیم کی روح اور اس کا لب لباب ہے۔ اس جامع اور نہایت مختصر سورت میں پوری قرآنی دعوت کی تلخیص حکیمانہ طور پر چند جامع ترین الفاظ و ترکیبات کے ذریعے کر دی گئی ہے۔ لہٰذا اس سورت کی پہلی ہی آیت میں جو کہ خود قرآن حکیم کی بھی سب سے پہلی آیت ہے، اللہ تعالیٰ بندوں سے اپنا تعارف رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ جیسی نہایت جامع تعریف سے کراتا ہے۔ یہاں الۡعٰلَمِیۡنَ سے کیا مراد ہو سکتا ہے اس کی تفسیر ایک اور مقام پر ٹھیک اسی مفہوم کی ایک اور آیت کے ذریعے اس طرح کی گئی ہے:

فَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الۡأَرۡضِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (جاثیہ: ۳۶)	پس سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، جو آسمانوں کا رب اور زمینوں کا رب (یعنی) تمام عالموں کا رب ہے۔

یہاں رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ اپنے ماقبل رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الۡأَرۡضِ (آسمانوں کا رب اور

زمینوں کا رب) کا بدل کل واقع ہو رہا ہے، جس سے الْعٰلَمِیْنَ کے معنے السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ ہی ٹھہرتے ہیں۔ لہٰذا اس کا نہایت واضح اور منصوص مطلب یہ ہوا کہ یہاں سارے آسمانوں اور ساری زمینوں کی تعبیر الْعٰلَمِیْنَ کے ذریعے کی جارہی ہے۔ یاد رہے کہ ہمارے پہلے مضمون میں آیات حم سجدہ: ۹-۱۲ کے تحت ساتوں آسمانوں میں موجود کل زمینوں اور خود ان سے متعلقہ دیگر سارے اجرام سماوی کی تخلیق کو قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَہٗٓ أَنْدَادًا (کہیے کہ کیا تم اُس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمینوں کو دو دن میں پیدا کیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو) کے ذریعے ظاہر کرتے ہوئے ان کے خالق اور پالن ہار کا تعارف بھی ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (وہی سارے عالموں کا رب ہے) ہی سے کرایا گیا تھا۔

نیز اس مفہوم کو مزید قوت واستحکام حسب ذیل آیت سے بھی حاصل ہو رہا ہے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ، یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهٖ، أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ، تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (اعراف: ۵۴)	بے شک آپ کا رب اللہ ہے، جس نے سارے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر استوا فرمایا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانک دیتا ہے کہ وہ اسے جلدی سے آلیتی ہے۔ اور سورج، چاند اور ستاروں کو بھی اس نے اپنے حکم سے تابع بنا کر پیدا فرمایا ہے۔ یاد رکھو کہ پیدا کرنا اور حکم چلانا اسی کا کام ہے۔ اللہ بہت بابرکت ہے، جو تمام عالموں کا رب ہے۔

ملاحظہ ہو کہ ساتوں آسمانوں اور ان کے مشتملات پر دلالت کرنے کے لئے یہاں مذکورہ بالا حم سجدہ والی آیات کے برخلاف پہلے نہایت واضح طور پر السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ کی ترکیب لائی گئی ہے۔ پھر چھ دنوں کی تخلیق کی تصریح کے ذریعے اس مفہوم کو مزید موکد بھی کیا جارہا ہے۔ پھر ان سب کی تخلیق کے متصل بعد باری تعالیٰ اپنا تعارف ایک اور مرتبہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہی سے کروا رہا ہے۔ ان سارے دلائل کی روشنی میں نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ الْعٰلَمِیْنَ کا

اطلاق بالکلیہ ساتوں آسمانوں اور ان کی موجودات پر ہوتا ہے۔

نیز شمارہ ۲۴ کے تحت ذُرِّيَّةٌ پر ہم نے جو کلام کیا تھا یہاں اس پر ایک اور اضافہ بھی ضروری ہے۔ لہذا اس لفظ کا اطلاق صرف فروع یعنی اولاد ہی پر ہوتا ہے، برخلاف اصول یعنی آباؤ اجداد کے۔ خود قرآن مجید نے بھی ان کے استعمالات میں واضح تفریق کی ہے، اور متعدد مقامات پر ان دونوں پر دلالت کرنے کے لئے دو الگ الگ الفاظ یکجا طور پر لے آئے ہیں۔ مثلاً حسب ذیل دو آیات میں اولاد کے لئے ذُرِّيَّةٌ اور ذُرِّيَّاتٌ اور اجداد کے لئے اٰبَآءُ ایک ساتھ استعمال کئے گئے ہیں:

أَوْ تَقُولُوٓا إِنَّمَآ أَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ (اعراف: ۱۷۳)	یا تم یہ کہنے لگو کہ شرک تو ہم سے قبل ہمارے اجداد نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد صرف ان کی اولاد تھے۔
وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ، وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (انعام: ۸۷)	(ہم نے) ان کے اجداد، اولاد اور بھائیوں میں سے بعض کو (ہدایت دی) اور انہیں منتخب فرمایا اور سیدھا راستہ دکھایا۔

چنانچہ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوحًا وَّاٰلَ إِبْرٰهِيمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو سارے جہانوں پر یعنی ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود زمینوں میں منتخب اور برگزیدہ فرمایا ہے! اب یہ کس طرح ممکن ہوگا اس کا جواب اگلی ہی آیت میں ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ کے ذریعے دیا جا رہا ہے کہ اس فلسفہء تعدد تخلیق انسانی میں وہ سب کے سب ایک دوسرے کی اولاد ہوتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ یہاں ذُرِّيَّةً حال واقع ہو رہا ہے، جس کا اطلاق نوحؑ، آل ابراہیمؑ اور آل عمران ہی کی طرح آدمؑ پر بھی لازمی و واجبی طور پر ہوتا ہے، اور آپؑ بھی کسی کی اولاد ہی ٹھہرتے ہیں اور یہ عین مطابق عقل و منطق بھی ہے کہ جب اولاد کو بکثرت زندگیوں سے نوازا جائے تو خود ان کے باپ کو کیوں نہیں۔ لہذا اپنی اولین تخلیق خصوصی کے علاوہ آپؑ کو جتنی بھی زندگیوں سے نوازا جائے گا

ان سب میں آپؑ رحم مادری ہی سے جنم لیں گے اور کسی نہ کسی کی ذریت ہی کہلائیں گے۔ یعنی حضرت آدمؑ کی حیثیت بیک وقت ابوالبشر کی بھی اور خود اپنی ہی اولاد کی اولاد کی بھی![1] چنانچہ یہ حقیقت بھی خود آپؑ ہی کے تعلق سے ان تفردات کے قبیل سے ہے جب آپؑ کے جنت سے ہبوط کے نتیجے میں افزائش نسل کی خاطر ابتدا میں سگے بھائی بہنوں ہی کو اضطراری طور پر رشتۂ ازدواج میں باندھا جاتا تھا، اور اس وقت ہر جوڑا بیک وقت میاں بیوی بھی ہوتا اور حقیقی بھائی بہن بھی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہاں امام رازیؒ نے بھی تمام کو ایک دوسرے کی اولاد تو قرار دے دیا مگر ظاہری پیچیدگی کی وجہ سے تاویل کا سہارا لیتے ہوئے حضرت آدمؑ کو اس سے مستثنیٰ رکھنے پر مجبور ہوئے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سارے جہانوں پر انتخاب اور برگزیدگی میں اور بھی بے شمار افراد شامل ہیں، مگر یہاں بطور نمونہ صرف چند کا تذکرہ کیا گیا ہے، کیوں کہ ان آیات کا بنیادی مقصد حضرت آدمؑ کی فرزندی ثابت کرنا تھا۔ ورنہ دیگر آیات میں دوسروں کے انتخاب کی بھی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً:

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (دخان:۳۲)	ہم نے اپنے علم سے بنی اسرائیل کو تمام عالموں پر منتخب فرمایا ہے۔
وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا، وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (انعام:۸۶)	ہم نے اسماعیل، یسع، یونس اور لوط کو ہدایت دی، اور سب کو تمام عالموں پر فضیلت دی۔

اب ہم تعدد تخلیق انسانی کی کیفیت پر نئی روشنی ڈالتے ہوئے اس فلسفے کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، قُلْ لِّلّٰهِ، كَتَبَ عَلٰى	آپ پوچھئے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کا ہے،

[1] یہ تفرد، مضمون نگار کی ذہنی اپج ہے، جس کے لیے قوی دلیل کی ضرورت ہے اور وہ یہاں تو نہیں ہے۔ (معارف)

نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ، لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ إِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ، اَلَّذِيۡنَ خَسِرُوۡٓا أَنۡفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (انعام:۱۲)	اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم کرلی ہے، یقیناً وہ تمہیں قیامت تک جماتا رہے گا، جس میں کوئی شک نہیں، (مگر) جن لوگوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں مبتلا کر رکھا ہے وہ ایمان لے آنے والے نہیں ہیں۔

یہاں مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضِ (آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی ہے) سے ظاہر ہے کہ اس آیت میں کلام ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں میں بسی مخلوقات کے تناظر میں ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں استشہاد لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ إِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ (یقیناً وہ تمہیں قیامت تک جماتا رہے گا) سے ہے۔ اکثر مفسرین نے ظاہری اشکال کے پیش نظر ہی یہاں إِلٰى (تک) کو مجازی طور پر ”فِی“ (میں) قرار دے کر اس فقرے سے ”بے شک وہ تمہیں قیامت میں جمائے گا“ مراد لیا ہے۔ جب کہ آج ہمیں اسے اس کے اپنے حقیقی معنے پر محمول کرنے میں کسی بھی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہے، کیوں کہ یہ آیت کریمہ عصر حاضر میں قرآن حکیم کے ابھرتے ہوئے جدید فلسفہء کائنات کی ایک بنیادی کڑی ہے، اور اس سمت میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اب جمع کرنے سے کیا مراد ہو سکتا ہے اس کے لئے ہمارے دوسرے مضمون میں بیان کردہ حسب ذیل آیت شریفہ سے حاصل ہونے والا مفہوم بھی پیش نظر رہے:

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِيۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ، وَهُوَ عَلٰى جَمۡعِهِمۡ إِذَا يَشَآءُ قَدِيۡرٌ (شوریٰ:۲۹)	اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق ہے، اور وہ جاندار بھی جنہیں اس نے ان دونوں میں پھیلا رکھے ہیں، اور وہ جب چاہے انہیں جمع کرنے پر قادر بھی ہے۔

یہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ لفظی اور معنوی دونوں ہی اعتبارات سے یہ آیت کریمہ زیر بحث آیت سے کس قدر میل کھانے والی اور اس کی شرح وتفسیر کرنے والی ہے۔ چنانچہ السَّمٰوٰتُ وَالۡأَرۡضُ کی ترکیب سے ظاہر ہے کہ دونوں مقامات پر گفتگو کائنات کی ساری زمینوں میں پھیلائی گئی مخلوقات کے پس منظر ہی میں ہو رہی ہے۔ اور دونوں ہی جگہ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اور عَلٰى

جَمْعِهِمْ کے ذریعے انہیں جمع کرنے کی بات بھی کی جارہی ہے۔ پھر اگر زیر بحث آیت میں موجودہ انسان کو مخاطب کر کے انہیں یقینی طور پر قیامت تک جمائے جانے کی بات کہی گئی تو یہاں اس کا بیان اسی اعتماد کے ساتھ راست طور پر ساری ہی زمینوں میں بسائی گئی مخلوقات کے ضمن میں بھی ہورہا ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہاں إِذَا حرف شرط ہے، جس کا استعمال کسی یقینی اور معلوم الوقوع امر کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جمانا اصلاً کائنات کی ان ساری مخلوقات کو آپس میں ایک دوسرے سے ملانا ہی ہے۔

نیز انسان کی کثرت تخلیق اور اس کے جمع بین السماوات کے اس بیان سے متصل پہلے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (اس نے اپنے اوپر رحمت لازم کرلی ہے) سے ظاہر ہورہا ہے کہ اسے ان پے درپے زندگیوں کا عطا کیا جانا باری تعالیٰ کی صفت ''رحیمیت'' کی بنیاد ہی پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے نافرمان بندوں پر رحم کا معاملہ کرتے ہوئے انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز ہونے کے لئے کثرت سے مواقع عطا کرتا جاتا ہے۔ ذہن نشین رہے کہ انسان کی کثرت تخلیق کے بیان کے موقع سے شمارہ ۲۱ میں بھی وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ کے ذریعے باری تعالیٰ کی اسی قبیل کی ایک اور صفت ''غفاریت'' کا بیان تھا کہ وہ اس کے گناہوں سے ہر مرتبہ صرف نظر کرتے ہوئے اسے اصلاح و درستی کے مواقع کثرت سے فراہم کرتا جاتا ہے۔ نیز شمارہ ۲۵ میں بھی وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ کے ذریعے ٹھیک یہی معنویت پیدا کی گئی تھی۔ اسی لئے جمع بین السماوات کے اعلان کے فوری بعد اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کا بیان ہورہا ہے کہ قیامت تک اتنی ساری زندگیاں عطا کئے جانے کے باوجود جنہوں نے اپنی سابقہ زندگیوں میں اپنی جانوں کو خسارے میں مبتلا کر رکھا تھا اور جن کا خاتمہ کفر و انکار اور عدم ایمان کی حالت میں ہوا تھا وہ اپنی کسی اگلی زندگی میں بھی ایمان لے آنے والے نہیں ہیں۔ یاد رہے کہ ٹھیک یہی حقیقت شمارہ ۵ میں بھی مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا، أَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ کے ذریعے بیان کی جاچکی ہے کہ سابق میں جس بستی والوں کو بھی ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک و برباد کیا گیا تھا وہ اپنی اگلی زندگیوں میں بھی ایمان کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہو سکے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ شمارہ مذکورہ بالا شمارے کی بھی تفسیر و تشریح کرنے والا ہے۔ (باقی)

مخاصمت اسلام میں "صہیونی مسیحیت" کا کردار
چند اہم زاویے

جناب غلام حسین بابر

تہذیب سے کیا مراد ہے؟ مغربی تہذیب سے کیا مراد ہے؟ مغربی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کیا دو مختلف تہذیبیں ہیں؟ جدید مغربی تہذیب کا مستقبل کیا ہے؟ کیا تہذیبوں کا تصادم ایک حقیقت ہے؟ یہ وہ مختلف سوالات ہیں جو تہذیب کی نسبت سے پائے جاتے ہیں اور ان سوالات سے متعلق کئی مفکرین نے اپنی آراء کو بھی پیش کیا ہے۔ لیکن حالات کی شدت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ جدید مغربی تہذیب اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے انسانیت کے لیے کس قدر اہم ہے اور کیا یہ تہذیب امن عالم اور انسانیت کی حقیقی صلاح وفلاح کا کوئی پہلو رکھتی ہے یا پھر اس تہذیب کے غلبے کا بنیادی مقصد چند مخصوص طبقات کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنا ہے؟

بعض مسلمان اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک سیکولر تہذیب ہے جس میں دین اور ایمان کی حیثیت فرد کی انفرادیت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا اجتماعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن حالات اور واقعات کا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جدید مغربی تہذیب ایک سیکولر تہذیب نہیں ہے بلکہ اس تہذیب کی ترتیب وتشکیل میں مذہب ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے انسانیت کی بقا اور خوش حالی کے لیے انتہائی خطرناک ہے کہ جدید مغربی تہذیب کی ترتیب وتشکیل میں جو بنیادی تصورات پائے جاتے ہیں وہ عیسائیت اور یہودیت کے ایک ایسے طبقے کے خود ساختہ مذہبی تصورات ہیں جو انتہا درجے کا متعصب، شدت پسند اور

لیکچرر بارانی زرعی یونی ورسٹی راول پنڈی، پاکستان۔

مفادات پرست ہے۔

جدید مغربی تہذیب کے اس شدت پسند گروہ کی نشان دہی ایک مسلمان مفکر کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''امریکہ میں مصیبت کی جڑ ''صہیونی مسیحیت'' ہے جس نے صہیونی یہودیت کی کوکھ سے جنم لیا ہے، صہیونی یہودیوں نے (جن کے ہاتھ میں امریکی معیشت، دولت وثروت اور ذرائع ابلاغ کی کلید ہے اور جو بالآخر امریکا پر اس درجہ تسلط رکھتے ہیں کہ سارے صدور اور حکمراں خواہی نہ خواہی ان کی مرضی سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کرپاتے) امریکی مسیحیوں کی معتد بہ تعداد کو شیشے میں اتار کر انہیں صہیونیت گزیدہ بنادیا ہے، انہیں ان خرافاتی عقیدوں پر ایمان لانے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ اور مسیحی دونوں بھائی ہیں۔ دونوں اللہ کی چیدہ و پسندیدہ قوم ہیں، دونوں کو اللہ نے زمین پر اپنی مشیت کو برپا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے لہذا دونوں سارے افراد بشر سے اعلیٰ وارفع ہیں ۔ دیگر فرزندان آدم ان کے نزدیک کسی شمار قطار میں نہیں ہیں اس لیے یہ دونوں مشیت الٰہی کو بروئے کار لانے کے لیے انہیں دھوکا دینے، ان کا استحصال کرنے ، ان کے ساتھ ہر طرح کی تذلیل، تحقیر، تمسخر اور قتل وغارت گری کا مقابلہ کرنے کا ہمہ گیر جواز رکھتے ہیں۔ صہیونی مسیحی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی مدد کریں اور اسرائیل کا سیاسی واجتماعی بازو بن کر اللہ کے پیغامات کو عملی جامہ پہنائیں اور جسم مسیح کے ذریعے صرف انجیلی منصوبے کو بروئے کار لانے پر اکتفانہ کریں''۔(۱)

جدید مغربی تہذیب کا علم بردار یہ طبقہ جس کی اصل پہچان ''صہیونی مسیحیت'' ہے انتہائی منظم اور اسلام و مسلمان دشمنی میں یک جان اور مکمل طور پر متحد ہے اور ان کی کامیابی کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے ان کا مدمقابل یعنی مسلمان اپنے معاشروں میں داخلی انتشار کا شکار ہے اور یہ انتشار اپنے تمام تر پہلوؤں یعنی مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور اخلاقی طور پر وقت کی مناسبت

سے بڑھ رہا ہے اور یہ بات حقیقت کے اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اگر مسلمان اسی طرح باہم دست وگریباں رہے تو جدید مغربی تہذیب کا علم بردار یہ شدت پسند گروہ مسلمانوں کے خلاف مستقبل میں ایسی سازشیں کرنے میں کامیاب رہے گا جس میں مسلمانوں کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ نقصان بھی ہوسکتا ہے جس کا خمیازہ شاید آنے والی کئی مسلمان نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔

صہیونی مسیحیت کی شدت پسندی کو جانچنا اور پھر اپنے معاملات کو بہتر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے اس لیے یہ بات نمایاں اہمیت کی حامل ہے کہ سب سے پہلے اپنے سامنے موجود درپیش چیلنجوں کو جانچا جائے اور اس کے ساتھ اپنے مجموعی حالات کا تجزیہ کیا جائے۔

مولانا گوہر رحمان نے امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز میں جہالت اور لاعلمی، نظریاتی تضادات، افتراق امت، مادی قوت میں سامراج کی برتری اور امت مسلمہ کے نااہل حکمراں کو قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کی مجموعی حالات کا تجزیہ کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

> "مسلمانوں کی حالت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صورت حال کچھ اس طرح بنتی ہے کہ چار قسم کے مسلمان سامنے آجاتے ہیں:
>
> پہلی قسم ان مسلمانوں کی ہے جو اسلام کو بطور نظام حیات ابھی سمجھے ہی نہیں ہیں اس نوع کے مسلمان غالب ترین اکثریت میں ہے ان کے نزدیک اسلام عبادات اور مخصوص قسم کے رسوم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ان کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اسلام میں معیشت، معاشرت اور سیاست کے شعبے بھی ہیں اور یہ مکمل نظام حیات ہے۔
>
> دوسری قسم ان مسلمانوں کی ہے جو اسلام کو بطور نظام تو سمجھ چکے ہیں لیکن ان پر مفاد پرستی اور خود غرضی غالب ہے اس قسم کے مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے ان کے دلوں میں دین کی محبت اور آخرت کی فکر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔
>
> تیسری قسم ان رسمی اور نسلی مسلمانوں کی ہے جو شعوری طور پر سیکولرازم اور لادینی نظام کو درست سمجھتے ہیں اور دور حاضر میں اس نظام کے نفاذ کے سرے

سے قائل ہی نہیں ہیں یہ لوگ اگرچہ تھوڑی تعداد میں ہیں لیکن معاشرے میں بااثر ہیں اور بدقسمتی سے ریاست کے اہم ترین اور حساس و موثر قسم کے مناصب پر فائز ہیں۔

چوتھی قسم ان خوش نصیب اور سعادت مند مسلمانوں کی ہے جو اسلام کا جامع تصور و شعور بھی رکھتے ہیں اور ان پر دنیا کی فکر اور مفاد پرستی و خودغرضی غالب بھی نہیں ہے، یہی مسلمان ہیں جو دین کو غالب کرنے اور طاغوتی نظام کو مٹانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے ہیں لیکن اس قسم کے شعوری اور جذبہ جہاد سے سرشار مسلمان بہت ہی تھوڑی تعداد میں ہیں اس لیے موثر کردار نہیں ادا کرسکتے''۔(۲)

جدید مغربی تہذیب کا علم بردار ''صہیونی مسیحیت'' کا طبقہ جس مسلمان طبقے کو اپنے لیے خطرہ اور جس مسلمان طبقے کے فکر، فلسفہ اور طرز عمل کو اپنی تہذیب کے لیے چیلنج سمجھتا ہے وہ یہی شعوری اور جذبہ ایثار و قربانی سے سرشار طبقہ ہے، یہ طبقہ دنیا کے مختلف معاشروں میں اسلامی تحریکات کی صورت میں اپنی نمایاں پہچان رکھتا ہے، اسلامی تحریکات کی مسلمان معاشروں میں ہونے والی پذیرائی نے اہل مغرب کو نہ ختم ہونے والے خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مغرب کا صہیونی مسیحیت کا شدت پسند گروہ انتہائی منظم انداز میں اسلامی تحریکات کے خلاف مدت دراز سے سازشیں کرنے میں مصروف عمل ہے ''صہیونی مسیحیت'' نے دھوکہ دہی اور عدم حقیقت کے ذریعے مغربی رائے عامہ کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر وہ مسلمان جو اپنی زندگی اصول، عقیدے اور نظریے کی بنیاد پر گزار رہا ہے یا مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مسلمانوں کے مجموعی مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کی جدوجہد کررہا ہے وہ بنیاد پرست، انتہا پسند اور دہشت گرد ہے۔

ڈاکٹر محمد ارشد اس ضمن میں کچھ اس طرح کا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

''خواہ اسلامی دنیا میں جاری احیائی تحریکات کو مغرب کے لیے خطرہ باور کرنے والا مغربی مفکرین کا طبقہ ہو یا انہیں کسی قسم کا خطرہ تسلیم نہ کرنے والا گروپ، دونوں ہی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ احیائی اسلامی تحریکات

مغرب، اس کے جدید عالمی نظام اور خود ان ممالک کے لیے جہاں وہ جاری ہیں ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں کیوں کہ ان کے خیالات میں چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد اسلامی نظام موجودہ ترقی یافتہ دنیا کی ضروریات پوری نہیں کرتا جس کے احیاء کی کوششوں میں یہ تحریکات مصروف ہیں دنیا میں اسلام کا بطور احیائی تصور رکھنے والا اور اس کی آواز بلند کرنے والا خواہ اعتدال پسندوں کا طبقہ ہو یا انتہا پسندوں کا ان کے لیے موجودہ مغرب میں جو اصطلاح سب سے عام اور رائج ہے وہ ہے اسلامی بنیاد پرست (Islamic Fundamentalist) کی، اس طرح کی جتنی اور جہاں کہیں بھی تحریکات جاری ہیں انہیں اسلامی بنیاد پرستی کا نام دیا جاتا ہے''۔(۳)

صہیونی مسیحیت کے اس شدت پسند گروہ میں شامل افراد کئی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں مغربی دنیا کے کئی قابل ذکر حکمراں اسی گروہ کے کلیدی ذمہ دار کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتے رہے جن میں امریکی صدور صدر لائنڈرون لی جانسن، جیمی کارٹر، رونالڈ ریگن اور جارج بش جونیئر کے نام قابل ذکر حیثیت سے موجود ہیں۔

صہیونی مسیحیت کے منصوبے کی عملی کارفرمائی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''صہیونی مسیحیت کے عقائد کو سیاسی طور پر برپا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر عمل کیا جارہا ہے:

۱- یہودی اللہ کی چنیدہ قوم ہیں لہذا ریاست اسرائیل کی حمایت اور ہر طرح سے اس کی مدد مسیحیوں پر بھی فرض ہے۔

۲- یہ ایمان رکھنا مسیحیوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اللہ نے قوم یہود کو ارض مقدس فلسطین عطا کردی ہے لہذا وہاں بنائی جارہی کالونیوں اور فتح کی ہوئی زمینوں کے یہودیانے کی حمایت واجب ہے۔

۳- شہر قدس یہود کو خدا کی طرف سے عطا کردہ ارض مقدس کا جزو لاینفک ہے لہذا اس کی تہوید، اس کو اسرائیل کا پایہ تخت تسلیم کرنا مسیحیوں پر بھی فرض ہے۔

۴- مسیحیوں پر واجب ہے کہ وہ یہ ایمان رکھیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر مسیح کی دوبارہ واپسی کے لیے ناگزیر شرط ہے، لہٰذا اس راہ کی ساری رکاوٹوں کو دور کرنا ان کے لیے بھی ضروری ہے جن میں مسجد اقصیٰ کا انہدام بھی شامل ہے۔

۵- معرکہ ہرمجدون کے یقینی ہونے پر ایمان لانا مسیحیوں پر فرض ہے یہ معرکہ مسیح کی واپسی سے پہلے ضرور پیش آئے گا اس لیے مساعی امن کو سبوتاژ کرتے رہنا اور مشرق وسطیٰ میں پیہم انتشار برپا کیے رہنا اور عرب و یہود کی دشمنی کو تازہ اور موثر بنائے رکھنا دینی عمل کا حصہ ہے۔ مساعی امن کے موثر ہو جانے سے ہرمجدون کے معرکے میں تاخیر ہوگی اور مسیح کی واپسی موخر ہوگی جب کہ اسرائیل وعرب کی رسہ کشی سے ان کی واپسی بہ عجلت اور یقینی ہوگی''۔(۴)

صہیونی مسیحیت کے ان عقائد کی عملی کارفرمائی کے سامنے جو حقیقت سب سے زیادہ رکاوٹ کے طور پر موجود ہے اس ''حقیقت صادقہ'' کا نام رسالت محمدیؐ ہے۔ رسالت محمدیؐ پر ایمان و یقین ہی دراصل جدید مغربی تہذیب کے لیے ایک چیلنج ہے کیوں کہ یہی ایمان بالرسالۃ مسلمانوں کے باہمی اتفاق و اتحاد، محبت و اخوت، جذبہ ایثار و قربانی اور شوق شہادت کا بنیادی محرک ہے اور اس کے ساتھ اسلام کا سرچشمہ علم، اہل ایمان کا تزکیہ، انفرادی و اجتماعی صلاح و فلاح اور اسلام کا بطور تہذیب و نظام کا ایک حقیقت ہونا سب رسالت محمدیؐ سے وابستہ ہیں۔

خرم مراد صاحب نے جدید مغربی تہذیب کے اساسی تصورات اور ان کی عملی کارفرمائی میں حائل رسالت محمدیؐ کو اس طرح پیش کیا ہے:

۱- مغربی تہذیب اور جدیدیت (Modernism) کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اب بالغ ہو چکا ہے کسی ماورائے انسان وجود یا ذریعے سے علم اور رہنمائی لینے کا محتاج نہیں۔ وہ مستغنی ہے خصوصاً خدا اور وحی جیسے ان ذرائع و تصورات سے، جن کو اس نے اپنے عہد طفولیت میں اپنے سہارے اور تسلی کے لیے گھڑ لیا تھا۔ رسالت محمدیؐ اس کے برعکس، یہ علم اور یقین بخشتی ہے کہ خالق کا وجود حقیقی ہے وہ علوم کا رشتہ بھی اس کے نام سے جوڑتی ہے زندگی کا بھی، وہی خالق حقیقی کھانا بھی کھلاتا ہے۔ شفا بھی بخشتا ہے، اختیار و قدرت بھی صرف اس کو حاصل ہے، زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بھی وہ دکھاتا ہے، انسان ہر لحاظ سے اس کا محتاج، فقیر اور غلام و بندہ ہے۔

۲- مغربی تہذیب کے فلسفہ علم (Epistemology) کی بنیاد یہ ہے کہ علم کا ذریعہ صرف انسانی حواس اور عقل ہے، تجربہ ومشاہدہ ہے، سائنسی طریقہ ہے مگر یہ سارا علم بھی ظنی ہے جو آج صحیح ہے وہ کل غلط ہوسکتا ہے بلکہ غلط ثابت ہونے کا امکان نہ ہوتو وہ علم ہے ہی نہیں، ایک عقیدہ ہے قطعی اور یقینی علم کے نام کی کوئی چیز دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی، جو معیار حق ہو، جس کے آگے لوگ سر تسلیم خم کریں جس کے لیے کوئی کسی سے مطالبہ کر سکے، اس کو مانو اور اس پر چلو اس کے برعکس رسالت محمدیؐ اس شعور سے معمور کرتی ہے کہ علم یقینی کا وجود ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی اور حضورؐ کی رسالت ہے زبردستی کسی پر نہیں کی جاسکتی لیکن جو مان لیں انہیں اس علم کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہیے جہاں اختیار ہو وہاں علم کے مطابق چلنا اور چلانا چاہیے مغرب نے حق اور باطل کے الفاظ کو متروک بنادیا ہے اور ان کا استعمال تہذیب وفیشن کے خلاف رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے لیے یہ الفاظ آج بھی سچائی اور زندگی سے بھرپور ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

۳- مغرب کے نزدیک اخلاق واقدار ہوں یا قوانین وضوابط ہر چیز اچھی ہے یا بری مفید ہے یا مضر جیسا اپنا اپنا احساس ہو نقطہ نظر ہو، پسند ہو یا ناپسند ہو، حقیقت کا انحصار دیکھنے والوں کی پوزیشن پر ہے چنانچہ ہر چیز اضافی (Relative) طور پر صحیح یا غلط ہوتی ہے کوئی چیز فی نفسہ حق اور باطل نہیں ہوسکتی۔ رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے نزدیک ان چیزوں کی جو حقیقت وحی نے طے کردی ہے اسے کسی کی رائے پسند وناپسند یا تجربے ودلیل سے بدلا نہیں جاسکا "اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے"۔ (الانعام ۶:۳۴)

۴- مغربی تہذیب کے نزدیک علوم غیبی اللہ، فرشتے، وحی، زندگی اور موت کے نام کی کوئی چیز کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے نزدیک، زندگی کے معنی ومقصد اور انسان کی حقیقت کا علم صرف علوم غیبی ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ حقائق، جن کی تعلیم رسالت محمدیؐ نے دی ہے جیتے جاگتے حقائق ہیں: "وہ غیب پر یقین رکھتے ہیں"۔ (البقرہ ۲:۳)

۵- دنیا اور دنیا کی زندگی سے رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کو اتنی ہی گہری اور بھرپور دلچسپی ہے جتنی اہل مغرب کو ہے لیکن مغرب کی دلچسپی کا ہدف یہیں دنیا میں انسان کی خوشی، راحت،

لذت اور زندگی کی کیفیت و معیار ہے کہ وہی مقصود ہیں۔اس کے برعکس رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کی دل چسپی دنیا میں اہل دنیا کی بھلائی اور آخرت میں اپنی بھلائی کے لیے ہے اس کے نتیجے میں دو بالکل مختلف قسم کی شخصیتیں اور معاشرے وجود میں آتے ہیں: ''دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے''۔(۵)،(الحشر ۵۹:۲۰)

صہیونی مسیحیت کی طرف سے برپا کی گئی تہذیبی یلغار میں رسالت محمدی کو بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اسی وجہ سے صہیونی مسیحیت کے اس شدت پسند گروہ نے رسالت محمدیؐ کے بارے میں ہمیشہ معاندانہ رویوں کا اظہار کیا ہے اور ان کے معاندانہ رویوں کے چند نمایاں پہلو درج ذیل ہیں:

۱- صہیونی مسیحیت کے رسالت محمدیؐ کے بارے میں معاندانہ رویہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ صہیونی مسیحیت نے مسلمانوں میں سے ہی ایک گروہ کو جدید مغربی تہذیب کا گرویدہ بنایا ہے جدید مغربی تہذیب سے مرعوب یہ گروہ رسماً اور نسلاً مسلمان ہے فکری اور شعوری اعتبار سے اسلامی نظام حیات پر جدید مغربی تہذیب کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ محدود ہے لیکن اپنے معاشرتی کردار اور اثرات کے حوالے سے اہم ہے۔ یہ طبقہ جدید مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے سبب رسالت و نبوت کی حقیقت سے جہاں انکار کرنے والا ہے وہاں پر یہ طبقہ سنت نبویؐ کی اسلامی نظام میں بنیادی حیثیت کو غیر اہم قرار دے کر جدید مغربی تہذیب کے عملی نمونوں کو اپنے ہاں رائج کرنا چاہتا ہے۔

علامہ محمد اسد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''موجودہ دنوں میں جب کہ مغربی تہذیب کا اثر مسلمان ملکوں میں زیادہ سے زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے اس ضمن میں نام نہاد مسلمان دانشوروں کے عجیب و غریب رویہ میں ایک اور محرک بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ بات قطعی طور پر ناممکن ہے کہ بیک وقت سنت نبویؐ کے مطابق بھی زندگی بسر ہو اور مغربی تہذیب کا دامن بھی نہ چھوڑا جائے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ نسل مغرب کی ہر چیز کی پرستش کرنے پر تیار ہے وہ بیرونی تہذیب کی پوجا محض اس لیے کرنے پر تیار ہے

کہ یہ بیرونی ہے، طاقتور ہے اور مادی چمک دمک رکھتی ہے۔ یہی ''مغربیت'' اتنی طاقتور وجہ ہے کہ ہمارے نبیؐ کی احادیث اور ان کے ساتھ سنت کا پورا ڈھانچہ تیزی سے غیر مقبول ہو رہا ہے۔ سنت نبویؐ واضح طور پر مغربی تہذیب کے بنیادی تصورات سے متصادم ہے چنانچہ جو لوگ مغربی تہذیب سے مرعوب اور مسحور ہیں انہیں ایک ہی راستہ نظر آتا ہے کہ سنت کو اس بنیاد پر مسلمانوں کے لیے غیر ضروری قرار دیں کہ یہ نامعتبر اور غیر ثقہ روایت پر مبنی ہے اور اس مختصر اور سرسری فیصلہ کے بعد آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کو اس طرح توڑ مروڑ لیا جائے کہ وہ مغربی تہذیب کی روح سے مطابقت پیدا کرلیں''۔(۶)

جدید مغربی تہذیب سے مرعوب مسلمانوں کا یہ طبقہ منظم اور مربوط انداز میں اپنے اثرات مسلمان معاشروں میں مرتب کر رہا ہے چنانچہ اس طبقے کے پاس وسائل و ذرائع کی فراوانی ہے اس لیے یہ آسانی سے کئی سادہ اور مجبور مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اہل علم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اس مغرب نواز طبقے کے مذموم مقاصد کے مقابل ایک حکمت عملی ترتیب دیں تاکہ جہاں ایک طرف مغرب نواز طبقے کا فکری میدان میں مقابلہ کیا جا سکے وہاں دوسری طرف عوام الناس کو اسلام کا حقیقی شعور و آگہی بھی مہیا کیا جا سکے۔

صہیونی مسیحیت کے رسالت محمدیؐ سے متعلق معاندانہ رویے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ بسا اوقات یہ علم و تحقیق کے نام سے ایسے افکار و نظریات لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں ان کا تعصب، خود غرضی، مفاد پرستی اور اسلام و پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ سے عداوت عیاں ہوتی ہے۔ اور ان کی علم و تحقیق کا بنیادی مقصد حقائق کو پانا نہیں ہوتا بلکہ اسلام کی مجموعی شبیہ کو مسخ کرنا، پیغمبر اسلامؐ کی ذات اقدس پر سوالات اٹھانا اور آپ کی پیغمبرانہ حیثیت کو مشکوک بنانا۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخی حیثیت کو متنازعہ بنانا ان کی تحقیقی سرگرمیوں کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

یہ بات بھی بہت اہم نوعیت کی ہے کہ صہیونی مسیحیت اپنی اصل کے اعتبار سے استشراقی فکر کا ایک تسلسل ہے اور آج کے دور میں استشراقی فکر کے حقیقی نمائندے کے طور پر مغرب میں

موجود گروہ دراصل صہیونی مسیحیت کا ہی ہے جو علم و تحقیق میں اسی طرح کا رویہ اپنائے ہوئے ہے جس طرح کا رویہ ماضی میں مستشرقین اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں اختیار کرتے تھے۔

پروفیسر اکرم ضیاء العمری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مستشرقین کا مطالعہ اسلام اور مطالعہ تاریخ اسلام متفرق رویوں کا حامل ہے اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذہنی سطح، معیارات اور ان کے مذہبی اور نسلی تعصبات کے مدارج مختلف ہیں تاہم اس قسم کا مطالعہ کرنے والے محققین کا تعلق زیادہ تر ان لوگوں سے ہے جو اسلام سے بالکل بیگانہ ماحول کی پیداوار ہیں یہ لوگ اپنے ہی فلسفوں اور اپنی ہی ثقافتوں کے ماحول میں جیتے جاگتے ہیں اس پس منظر کے ساتھ ظاہر ہے کہ ان کے لیے اسلام کی صحیح قدر پہچاننا مشکل ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے صاحب ایمان مسلمان کے رویے کے اصل محرکات کو سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے وہ اس رویے کو نہ تو انفرادی سطح پر سمجھ سکتے ہیں نہ معاشرتی سطح پر ہی اس کی اہمیت کا ادراک کر سکتے ہیں وہ جب اسلامی تاریخ کے واقعات کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے یورپ کی تاریخ پر قیاس کرتے ہیں حالاں کہ دونوں تاریخیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی فرق رکھتی ہیں۔ مزید براں ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اہل یورپ کا وطیرہ بھی رہا ہے کہ وہ ساری دنیا کو اپنے تاریخی واقعات کے تناظر ہی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں چوں کہ یورپ ماضی قریب میں حربی اور فنی میدانوں میں آگے رہا ہے اس لیے ان لوگوں کے اندر یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ ہر خوبی کو اپنے ہی ساتھ منسوب کیا جائے اور ہر نقص کو دوسروں کے سر تھوپ دیا جائے''۔ (۷)

ڈاکٹر عماد الدین خلیل غلط اصولوں اور مذموم مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کی جانے والی تحقیقی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی بھی اہم کاوش کی بنیاد اگر غلط

اصولوں پر ہوتو اس میں دو بنیادی خامیاں ہر حال میں باقی رہیں گی۔ پہلی خامی یہ ہوگی کہ اس میں جمالیاتی اثر کا فقدان ہوگا جس سے کوئی وجدانی عمل انجام پاتا ہے دوسری خامی یہ ہوگی کہ ایسی پختہ علمی بنیادوں کا بھی فقدان ہوگا جس کی بدولت اس کا حسیاتی عمل پورا ہوتا ہے انسانی تاریخ کے کسی بھی موضوع کے مقابلے میں سیرت طیبہ کے موضوع پر تحقیقی کاوش میں دو شرطوں کا پایا جانا بدرجۂ اتم ضروری ہوگا مغرب میں سیرت طیبہ کے موضوع پر بحث و تحقیق میں بنیادی طور پر ان دو شرطوں یا ان میں سے کسی ایک کا فقدان نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ سیرت پر مغرب کے مطالعات اصل موضوع سے بے نیاز اور روح نبوت سے عاری تھے مستشرقین نے اپنے مطالعات میں جن نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی ان کا سرچشمہ علمی اصول نہیں بلکہ ''مطلب خویش'' تھے جس کی وجہ سے تاریخی تحقیق کے ضوابط کے مطابق بھی سیرت کی جمالیت اور زمانہ نبوت کی روح کو وہ منتقل نہیں کر سکے کیوں کہ انہوں نے سیرت کے حسن و قبح کو عصری پیمانہ سے ناپنا چاہا حالاں کہ یہ پیمانہ ہی غلط تھا''۔(۸)

صہیونی مسیحیت کے فلاسفر کے طور پر کام کرنے والے عصر حاضر کے مغربی مفکرین برنارڈ لوئس (Bernard Lewis)، سموئیل پی ہنٹنگٹن (Samuel P.Huntington)، ڈینیل پائپس (Danial Pipes) اور فوکویاما (Fukuyama) وغیرہ کی تحقیقات کا اگر ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان مفکرین نے کس طرح صہیونی مسیحیت کے ایجنڈہ کی عملی کارفرمائی کے لیے تحقیق کے نام سے مختلف قسم کے تصورات پیش کرنے کی کوشش کی ہے برنارڈ لوئس کے تصورات کی آئینہ دار اس کی دو معروف کتب ہیں جن میں The Crisis of Islam اور What Went Wrong? شامل ہیں (۹) سموئیل پی ہنٹنگٹن کے تصورات کی آئینہ دار اس کی معروف کتاب The Clash of Civilization ہے۔(۱۰)

ڈینیل پائپس کے تصورات کی ترجمان اس کی کتاب Militant Islam Reaches America ہے (۱۱) اور فوکویاما کے افکار و نظریات اس کی کتاب The End of History میں

موجود ہیں۔(۱۲)

صہیونی مسیحیت کے نمائندوں نے اسلام کے تمام پہلوؤں سے متعلق تحقیق کے نام سے ایسے افکار ونظریات پیش کیے ہیں جو تحقیق کے مسلمہ اصولوں پر پورے نہیں اترتے ،مگران کی تحقیقی سرگرمیوں کا خاص ہدف ذات رسالت مآبؐ ہے ، یہ تحقیقی اسلوب اختیار کرتے ہوئے آپؐ کی ذاتی زندگی اور پیغمبرانہ حیثیت کے مختلف پہلوؤں پر اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی اکثر تحقیقی کاوشوں میں تعصب اور اسلام و پیغمبر اسلام سے عداوت کا پہلو غالب ہوتا ہے۔

۳- صہیونی مسیحیت کے ذات رسالت مآبؐ سے معاندانہ رویے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ عالمی سازشوں کے ذریعے مسلمان معاشروں میں ایسے احساسات وجذبات اور نظریات کو فروغ دیتے ہیں جو علاقائیت ،نسلیت ،لسانیت ،قومیت اور شخصیت پرستی کی صورت میں ہوتے ہیں ،چوں کہ رسالت محمدیؐ مسلمانوں کے باہمی اتفاق ومحبت کا سرچشمہ ہے اسی لیے صہیونی مسیحیت ایسے افکار ونظریات کے فروغ کے لیے مختلف انداز میں کوشش کرتی ہے تاکہ مسلمانوں میں مختلف قسم کی عصبیتیں پروان چڑھیں تاکہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا وہ باہمی اتفاق ومحبت اور اخوت کا جذبہ ختم ہوسکے جو رسالت محمدیؐ کی بنیاد پر قائم ہے اگر عصر حاضر میں مسلمانوں کے حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو مسلمانوں میں کئی طرح کی عصبیتیں فروغ پارہی ہیں جس سے ایک طرف مسلمان معاشروں کا استحکام کم زور ہورہا ہے اور دوسری طرف صہیونی مسیحیت اپنے مذموم مقاصد میں آگے بڑھ رہی ہے۔صہیونی مسیحیت جس نے صہیونی یہودیت کی کوکھ سے پرورش پائی ہے یہی صہیونی یہودیت ماضی میں مسلمان معاشروں میں عصبیت کے فروغ کے ذریعے مسلمانوں کی وحدت کو پارا پارا کرچکی ہے جس کی واضح مثال سلطنت عثمانیہ کا ختم کیا جانا ہے۔

صہیونی منصوبے کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

۱- سلطنت عثمانیہ کو جو مسلمانوں کے مفادات کی نگرانی کرتی تھی ختم کرکے صرف ترکی کی حدود میں مقید کردیا گیا اور وہاں بھی نظام حکومت تبدیل کرکے ایک لادینی ،مغرب پرست اور یہود نواز حکومت قائم کردی گئی اور یوں عملاً یہودی مفادات کے تحفظ کو یقینی بنالیا گیا۔

۲- مغلیہ سلطنت کے حصے بخرے کر کے چھوٹی چھوٹی کم زور ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا اوران پر ایسے حکمراں مسلط کیے گئے جو یہودی مفادات کی نگرانی کرسکیں۔

۳- منصوبے کے عین مطابق انگلستان، روس اور امریکہ کی مدد سے فلسطین کی سرزمین پر ایک آزاد یہودی ریاست قائم کردی گئی اور اسے عسکری طور پر اتنا طاقتور بنادیا گیا کہ وہ مشرق وسطیٰ کی سپر پاور بن گئی۔

۴- عربوں میں قومیت کا زہر داخل کر کے انہیں دنیائے اسلام سے علاحدہ کردیا گیا اور اسلام کی بجائے ان کا تشخص عرب قومیت میں بدل دیا گیا۔

۵- خود عرب ریاستوں کے درمیان اپنے گماشتوں کے ذریعہ شدید اختلافات پیدا کردیے گئے تاکہ وہ اپنے مشترکہ دشمن اسرائیل کے خلاف متحد نہ ہوسکیں۔

۶- مشرق وسطیٰ میں معدنی تیل کی دریافت کے بعد، شروع میں تو ان سادہ لوح عربوں کو صرف رائلٹی کی حقیر رقم دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جب ان میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہونا شروع ہوا تو انہیں عیش وعشرت کی ترغیبات دے کر ان کے اخلاق و کردار کو اتنا تباہ کردیا گیا کہ وہ دنیا بھر میں حماقت، سادہ لوحی اور عیاشی کا نشان بن گئے یہ وہ آزمودہ شیطانی حربہ ہے جس کا ذکر صہیونی دستاویزات میں کیا گیا ہے۔(۱۳)

اس حکمت عملی سے:

۱- وہ مسلمان جنہوں نے بے سروسامانی کے باوجود صرف اپنے جذبہ ایمانی کی قوت سے قیصر و کسریٰ کے محلات کو زمیں بوس کر کے انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرایا تھا، عیش و عشرت میں مبتلا ہوکر خود اپنی خواہشات نفس کے غلام ہوگئے اور بجائے اس کے کہ اس خداداد دولت کا استعمال مسلمانوں کو طاقتور بنا کر کیا جاتا صرف آرام و آسائش اور تزئین و نمائش پر کیا جانے لگا۔

۲- عیش وعشرت کے وسائل خواہ وہ عورتیں ہوں یا لمبی لمبی ایئر کنڈیشنڈ موٹریں یا دوسری اشیائے تعیش، سب یہودیوں کے پاس بہ افراط موجود تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معدنی تیل کی فروخت سے حاصل شدہ ساری دولت تو امریکہ اور یورپ کے یہودی بنکوں میں منتقل ہوئی اور آرام طلبی کی افیون

نے مشرق وسطی کے مسلمان فرماں رواؤں اور عوام کے ذہن وجسم کو مفلوج کیا۔(۱۴)

جس طرح کا کھیل ماضی میں صہیونی یہودیت نے کھیلا تھا اسی طرح کا کھیل موجودہ دور میں صہیونی مسیحیت کھیل رہی ہے۔

صہیونی مسیحیت کے رسالت محمدیؐ سے متعلق معاندانہ رویہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ چونکہ صہیونی مسیحیت کے نیو ورلڈ آرڈر (New World Order) کے سامنے چیلنج کے طور پر جو قوت موجود ہے وہ ذات رسالت مآبؐ کی ہے۔اس لیے کہ آپؐ کا قائم کردہ طریقہ زندگی اس قدر مستحکم، قابل عمل اور حقائق پر مبنی ہے کہ کوئی انسانی عقل اور تجربات ومشاہدات پر مبنی تشکیل شدہ نظام اس فطری نظام حیات کی جگہ نہیں لے سکتا۔اسی لیے صہیونی مسیحیت اپنے خود ساختہ، مادیت پرستانہ، لادینیت، حاکمیت جمہور، قوم پرستانہ اور حیوانی ازدواج سے مزین نظام کی عملی کارفرمائی کے سامنے جو چیلنج پاتی ہے وہ ذات رسالت مآبؐ کا ہے کیوں کہ آپؐ کی جانب سے انسانیت کے لیے تشکیل دیا گیا نظام حیات محض عقل انسان کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلامی نظام حیات ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے باقی نظاموں اور نظریات سے مختلف اور ممتاز کرتی ہے، اسی طرح آپؐ کی طرف سے تشکیل پانے والا نظام حیات انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ ایمان اور نفس کی اصلاح کا ضامن بھی ہے علاوہ ازیں دین ودنیا کی وحدیت اور انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن رکھنے والا ہے۔اندھی تقلید اور غیر ضروری تنقید سے ہٹ کر اسلام انسانوں کو تعقل اور تفکر کی ترغیب دیتا ہے اور زمانے کے ثبات اور تغیرات میں مکمل ہم آہنگی پیدا کرنے والا ہے، اور صرف نظری اور فلسفیانہ نظام کی صورت میں نہیں بلکہ ایک مکمل، اصلاحی اور انقلابی دین کی حیثیت سے وقت کی مناسبت سے لوگوں کے سامنے حقائق کو لاتا ہے یہ وہ حقائق ہیں جس کی وجہ سے صہیونی مسیحیت ہمیشہ اسلام مخالف سرگرمیوں کا ارتکاب کرتی ہے۔

۵۔ صہیونی مسیحیت کے معاندانہ رویے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ گروہ یا تو طاقت کے مراکز خود قائم کرتا ہے۔یا پھر طاقت کی حامل قوتوں یا اداروں پر اختیاری اور فیصلہ کن پوزیشن حاصل کرکے اپنی پسند اور مفادات کے قوانین بناتا ہے اور ضرورت کے وقت اپنی مرضی کے مطابق فیصلے اور نتائج بھی حاصل کرتے ہیں، اگر اقوام متحدہ کے قیام سے لے کر آج تک کی کارکردگی کا جائزہ لیا

جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اقوام متحدہ ہمیشہ چند مغربی طاقتوں جن میں صہیونی مسیحیت سرفہرست ہے۔ان کے مفادات کی آئینہ دار رہی ہے۔اقوام متحدہ نے ہمیشہ مسلمان ممالک کو اس بات کا پابند بنا کر رکھا ہے کہ وہ کوئی ایسی قوت یا ٹیکنالوجی حاصل نہ کریں جس سے صہیونی مسیحیت کے نمائندہ ملک ''امریکہ اور اسرائیل'' کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو اس لیے اقوام متحدہ ہمیشہ ایسے مسلمان ممالک پر پابندیاں لگائے رکھتی ہے یا ایسے مسلمان ممالک پر کسی طرح کا کوئی دباؤ قائم رکھتی ہے کہ وہ آگے چل کر کوئی ایسا اختیار یا قوت نہ حاصل کریں جس سے صہیونی مسیحیت کے مفادات خطرات سے دوچار ہوں۔

یورپ میں تشکیل پانے والا سیاسی اتحاد یورپی یونین ہی دراصل صہیونی مسیحیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اور یہ وسیع تر اتحاد صہیونی مسیحیت کے لیے ایک ایسے ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے جس کو صہیونی مسیحیت اپنے مفادات کے عین مطابق استعمال کرتی ہے، عراق اور افغانستان کی جنگ میں یورپی یونین سے وابستہ ممالک نے ہر ممکن طریقے سے صہیونی مسیحیت کی معاونت کی ہے اور مسلمانوں کے قتل عام میں تا حال شریک کار ہے، دلچسپی اور حیرت کا پہلو یہ ہے کہ دس لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے قتل کے باوجود بھی اقوام متحدہ کا کردار انتہائی شرمناک نوعیت کا ہے۔عراق اور افغانستان کی جنگ کے بطن سے جنم لینے والے دیگر کئی ایسے ہولناک پہلو ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان جنگوں کا اصل مقصد صہیونی مسیحیت کے لائحہ عمل کی کارفرمائی ہے۔عراق اور افغانستان کی جنگ کی کوکھ سے جنم لینے والا گوانتاموبے جیل، ابوغریب جیل، قندھار اور بگرام ایئر بیس کے عقوبت خانے اور دیگر کئی خفیہ ٹارچر سیل، اور پھر ان عقوبت خانوں میں قرآن مجید کی تقدیس کا دانستہ طور پر پامال کیا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ صہیونی مسیحیت ایک وسیع تر منصوبہ پر عمل پیرا ہے جس کی اصل منزل مسلمانوں کو مغلوب بنانا، مسلمانوں کو بے اختیار کرنا اور مسلمانوں کے کردار، ان کی تہذیب وتمدن اور اسلامی نظام کو عالمی امن کے لیے خطرہ قرار دے کر مسلمانوں پر جنگیں مسلط کرنا اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شامل ہیں۔صہیونی مسیحیت نے اس مقصد کے لیے ایک خطرناک اور تباہ کن ہتھیاروں سے مزین ایک فوجی اتحاد (NATO) نیٹو کے نام سے قائم کیا ہے، صہیونی مسیحیت کے لائحہ عمل میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے یہ فوجی اتحاد اقوام متحدہ کی

عنایت سے مسلمان ممالک پر ایک بدمست ہاتھی کی طرح چڑھ دوڑتا ہے، اور پھر ان ممالک میں تباہی کا ایک ایسا طوفان برپا کرتا ہے جس سے فرعون، چنگیز اور ہلاکو کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔

۶- صہیونی مسیحیت کے معاندانہ رویے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی نظر میں ہر وہ مسلمان دہشت گرد، انتہا پسند، بنیاد پرست اور فاشسٹ ہے جو کسی طرح سے بھی اسلام، پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ اور اسلامی اقدار و روایات کے ساتھ اپنی وابستگی قائم رکھے ہوئے ہے، صہیونی مسیحیت کے مذموم مقاصد کے مقابل اگر مسلمان اپنے دین، ملک اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے کسی طرح کی بھی کوئی جدوجہد کرتا ہے تو اس کی نظر میں وہ دہشت گرد ہے۔

صہیونی مسیحیت نے ہمیشہ ان اسلامی تحریکوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھا ہے جو دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کی بقا اور سلامتی کی فکرمند ہیں۔ ایک انتہائی منظم اور مربوط انداز میں صہیونی مسیحیت عرصہ دراز سے ان اسلامی تحریکوں کو کمزور کرنے اور انہیں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اسلامی تحریکوں کے اثرات کو کم کرنے کے لیے صہیونی مسیحیت نے ہمیشہ ایسے گروہوں کی سرپرستی کی ہے جس کی پہچان لادینیت اور مادہ پرستی ہے اور اس کے علاوہ اسلامی تحریکوں کو بدنام کرنے کے لیے دہشت گردی، بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کی اصطلاحات ایجاد کی گئی ہیں۔

الغرض اب یہ بات ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنی چاہیے کہ "صہیونی مسیحیت" اسلام، پیغمبر اسلامؐ، اسلامی اقدار و روایات، اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمان دشمن گروہ ہے جو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہے اور یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ طاقت کے حامل عالمی ادارے جن میں سرفہرست اقوام متحدہ ہے نہ صرف صہیونی مسیحیت کے زیر اثر ہیں بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے صہیونی مفادات کے تحفظ کے ضامن ہیں مسلمانوں کو یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ اقوام متحدہ سے یا مغربی طاقتوں سے انصاف کی توقع رکھنا بالکل عبث اور وقت کا ضیاع ہے۔ عراق، افغانستان اور لبنان پر مسلط کی گئی جنگوں کے پس منظر میں اقوام متحدہ کا کردار انتہائی مایوس کن رہا ہے اور حالیہ دنوں میں فلسطین کے علاقوں پر اسرائیل کی وحشیانہ بمباری پر اقوام متحدہ کا خاموش تماشائی بنے رہنا اس بات کا آئینہ دار ہے کہ اقوام متحدہ صرف اور صرف چند بڑی طاقتوں کے مفادات کی نگہبان ہے۔ یقیناً حالات کی شدت اس بات کی متقاضی ہے کہ مسلمان

جہاں پر صہیونی مسیحیت کے مذموم مقاصد کا ادراک کریں وہیں باہمی ادب واحترام، اتفاق و یگانگت اور اخوت و بھائی چارے جیسی اقدار و روایات کو فروغ دیتے ہوئے اس بات کا عملی ثبوت دیں کہ وہ امت واحدہ ہیں اور حالات کی مناسبت سے ایسالائحہ عمل ترتیب دیں جس سے دنیا میں عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہ سکیں اور آزاد حیثیت سے اپنی تہذیبی اور تمدنی اقدار پر عمل پیرا ہو سکیں۔

حواشی

(۱) پرواز رحمانی، مغربی تہذیب کا چیلنج اور اسلام، ص ۱۶، منشورات لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء۔

(۲) مولانا گوہر رحمان، تفہیم المسائل ۵/۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، مکتبہ تفہیم القرآن مردان، اگست ۲۰۰۲ء۔

(۳) ڈاکٹر ارشد، مغرب اور اسلامی بنیادی پرستی، ص ۱۹، کاشف پبلی شرز، لاہور۔

(۴) مغربی تہذیب کا چیلنج اور اسلام، ص ۲۱، ۲۲، منشورات لاہور ۲۰۰۷ء۔

(۵) خرم مراد، مغرب اور عالم اسلام ایک مطالعہ، ص ۲۰، ۲۱، ۲۲، منشورات لاہور ۲۰۰۶ء۔

(۶) علامہ محمد اسد، اسلام دوراہے پر، ص ۴۳، آگہی پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۰ء۔

(۷) اکرم ضیاء العمری، مدنی معاشرہ عہد رسالت میں، ص ۲۳، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۵ء۔

(۸) ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، عربی اسلامی علوم اور مستشرقین، ص ۷۴، توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کشن گنج بہار، ۲۰۰۴ء۔

(۹) Bernard Lewis, The Crisis of Islam, PHOENIX, London 2004, What Went Wrong? Oxford, University Press. 2002.

(۱۰) Samuel, P. Huntington, The Clash of Civilization, Simon & Schuster New York, 1996.

(۱۱) Danial Pipes, Militant Islam Reaches America, w.w.Norton & Company New York, London 2002.

(۱۲) Francis Fukuyama, The End of History and the last Man, Free Press, 1992.

(۱۳) ابوالحسن، تسخیر عالم کا یہودی منصوبہ، ص ۵۳، ۵۴۔

(۱۴) ایضاً، ص ۵۴۔

حدیقہ سنائی کا ایک نادر نسخہ، حدیقۃ الحقیقہ

جناب توفیق احمد قادری چشتی

راقم الحروف توفیق احمد چشتی تقریباً ۱۹۶۰ء سے قدیم مخطوطات اور نوادر اشیاء کا کاروبار کرتا ہے یہی کاروبار میرے خلف اکبر جناب افتخار احمد عرف جیلانی سلمہٗ بھی کرتے ہیں، انہوں نے حکیم سنائی کا نسخہ حدیقۃ الحقیقہ کہیں سے خریدا جب یہ نسخہ امروہہ لائے تو مجھے دکھلایا۔ میں نے پہلی ہی فرصت میں اس خطی نسخہ کو آخری چھٹی صدی ہجری زیادہ سے زیادہ اوائل ساتویں صدی ہجری کا جانچا مگر اپنی تسلی کے لیے میں ۱۶/جنوری ۲۰۰۸ء کو خدابخش لائبریری پٹنہ پہنچا اور وہاں کے نائب ناظم کتب خانہ جناب مولانا سلیم الدین اور جناب مظفر حسین صاحب سے ملا، ان کے سامنے اپنا خرید کردہ مخطوطہ حدیقہ سنائی رکھا ان دونوں بزرگوں نے اپنی لائبریری کے حدیقہ سنائی کے تمام مخطوطے نکالے اور ہمارے نسخے سے اس کا تقابل کیا بحمد اللہ تعالیٰ ہمارا مخطوطہ ان تمام مخطوطوں سے افضلیت کا شرف حاصل کرتا ہے۔ خدابخش لائبریری کے انگریزی کیٹلاگ جس کے مرتب مولانا مقتدر ہیں اس کی جلد اول صفحہ ۲۱ طبع دوئم ۱۹۶۱ء میں کسی انگریز مورخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حدیقہ سنائی ۵۳۷ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ۸۰ سال بعد ۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۰ء میں اس کو ترتیب دیا گیا ہے، انگریز مورخ کا یہ قول حکیم سنائی نور اللہ مرقدہٗ کے اس حسب ذیل شعر سے رد ہو جاتا ہے جو آپ کے دیوان حدیقۃ الحقیقہ کے اخیر میں اس طرح لکھا ملتا ہے:

مالک نیشنل بک ڈپو، بازار گذری، امروہہ (جے۔ پی۔ نگر) یو پی، انڈیا۔

پانصد و بست و چار رفتہ تمام پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

حکیم سنائی خود فرماتے ہیں، میں نے اس نسخے کو ۵۲۴ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۵۲۵ھ میں اس کو ختم کیا۔ اگر ہم ۵۲۵ھ میں ۸۰ سال اور جوڑ دیں تو ۶۰۵ھ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا یہ خطی نسخہ اسی عہد کے قریب کا ہے۔

اس انگریز مورخ کا ایک قول کیٹلاگ خدابخش لائبریری پٹنہ جلد اول صفحہ ۲۰ پر ہے کہ سنائی نے حمد اللہ تعالیٰ سے اپنا دیوان شروع نہیں کیا انگریز مورخ کا قول اس طرح ملتا ہے:

(Reputation of being one) of the greatest of Sufi poets

نعت or حمد would begin any of his work without either.

حکیم سنائی سب سے پہلے توحید الٰہی سے اپنا کلام شروع فرماتے ہیں صوفیہ کا اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہی توحید الٰہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس حدیقہ سنائی کے ابتدا میں حمد الٰہی اس طرح فرماتے ہیں:

"ای دروں پرور بروں آرائے۔ وی خرد بخش بی خرد بخشائے خالق و رازق زمین و زمان۔ حافظ و ناصر مکین و مکان"۔

حالانکہ اس مخطوطے میں حمد الٰہی اور نعت رسول پاکؐ و مدح صحابہ کرام و خصوصاً خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے ایسی مدح سرائی فرمائی ہے جو شاید کسی کے قلم سے نہ ہو (مخطوطہ ورق ۱۹۷لف) ان کے علاوہ ائمہ اربعہ جناب امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام حنبل رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدح بھی ہے۔

جناب قاضی نوراللہ شوشتری المتوفی ۱۰۱۹ھ مطابق ۱۶۱۰ء اپنی کتاب مجالس المومنین میں حکیم سنائی کو شیعہ امامیہ کے زمرہ میں شامل کر گئے ہیں آپ کو ہی کیا انہوں نے تو مذہب شیعہ امامیہ کو وسعت دینے کی غرض سے تمام مسلمہ طور کے سنی بزرگ طبقہ صوفیہ عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو تقیہ میں سنی کہہ دیا ہے، جس کی وجہ سے بعض محققین نے ان کو "شیعہ گر" کا لقب دیا ہے، قاضی نوراللہ شوشتری کے ہی ہم مذہب شیعہ مجتہدین نے علم تصوف اور صوفیہ کے رد میں اپنے ائمہ معصومین کی احادیث کی روشنی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کو مختصراً نقل کیا جاتا ہے:

جناب علامہ اردبیلی مقدس المتوفی ۹۹۳ھ مطابق ۱۵۸۵ء کی ''حدیقۃ الشیعہ''۔

جناب علامہ محمد باقر مجلسی اصفہانی المتوفی ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء کی ''عین الحیٰوۃ''۔

جناب مولانا غفران مآب دلدار علی نصیر آبادی متوفی ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء کی ''ذوالفقار''۔

جناب سید العلماء حسین بن دلدار علی ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء کی ''حدیقہ سلطانیہ''۔

جناب مفتی محمد عباس شوشتری لکھنوی ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء کی ''اجناس الجناس''، ''مثنوی من وسلویٰ''۔

جناب مرزا محمد علی لکھنوی کی ''نجوم السماء'' ۱۹ویں صدی عیسوی۔

جناب مرزا جعفر فصیح کی ''برق لامع'' ۱۹ویں صدی عیسوی۔

جناب صدر الافاضل اظہار الحسنین کی ''شیخ جیلانی'' مدیر رسالہ اصلاح، کھجوا ضلع سارن صوبہ بہار۔

حدیقۃ الحقیقۃ کا تقابل بعہد مصنف صاحب نسخۂ سیر الاولیا سے : سید محمد مبارک علوی المعروف بہ میر خرد کرمانی ثم الدہلویؒ متوفی ۷۷۰ھ مطابق ۱۳۶۸ء نے اپنی کتاب سیر الاولیاء کے دیباچے میں حسب ضرورت حکیم سنائی کے کلام کو نقل کیا ہے۔ جب ہم اس خطی نسخہ کے بعض اشعار کا صاحب سیر الاولیا کی مطبوعہ کاپی سے تقابل کرتے ہیں تو زبردست تضاد نظر آتا ہے۔ اس کے بعد میں اواخر ماہ فروری ۲۰۰۸ء کو نیشنل میوزیم نئی دہلی گیا۔ شعبۂ مخطوطات عربی فارسی کے انچارج محترم ڈاکٹر مولانا نسیم اختر صاحب سے ملا۔ انہوں نے مجھے سیر الاولیاء کا خطی اور بڑا قیمتی نسخہ بعہد مصنف دکھلایا۔ اس میں وہی اشعار تھے جو مطبوعہ نسخہ سیر الاولیاء میں ہیں۔ اب ان اشعار کا خطی نسخہ سے تقابل کرتے ہیں تو بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

سیر الاولیاء میں ہے:

از زباں صادق و ز جان صدیق چوں نبی مشفق چوں کعبہ عتیق

ہمارے مخطوطہ کے ورق ۹۷ میں اس طرح ہے:

از زباں صادق و ز جان صدیق چوں نبی صادق کعبہ عتیق

یعنی صاحب سیر الاولیا۔ لفظ (مشفق) استعمال کرتے ہیں اور ہمارے مخطوطہ کے ورق

مذکور میں لفظ (صادق) ہے صاحب سیر الاولیاء کے ترجمہ اردو مطبوعہ ککے زئی لاہور میں حضرت ابوبکر صدیق کے لیے حکیم سنائی کا شعر اس طرح ملتا ہے:

حور صدر قیامتش خواند رافضی قدر او کجا داند

ہمارے قدیم مخطوطہ کے ورق ۹۹ ب پر یہ شعر اس طرح ہے:

صور صدر قیامتش خواند رافضی قدر او کجا داند

صاحب سیر الاولیاء نے لفظ (حور) لکھا ہے مخطوطے میں (صور) ہے۔

صاحب سیر الاولیاء میں صفحہ ۵ پر ہے:

آنکہ جان بہر خاندان خواہد کے علی را بجاں زیاں خواہد

مخطوطہ قدیم میں ہے:

آنکہ جان بہر خاندان کاہد کے علی را بجاں زیاں خواہد

مخطوطہ ورق ۱۰۰ الف صاحب سیر الاولیاء لفظ ر (خواہد) لکھتے ہیں۔ یہ تو میں نے صاحب سیر الاولیاء سے مختصر سا تقابل کیا ہے۔

حدیقۃ الحقیقہ ۱۸۵۹ء میں ممبئی میں طبع ہوئی۔ اس مطبوعہ نسخے اور ہمارے قدیم خطی نسخے سے تقابل کیا جائے تو بعد المشرقین صاف نظر آئے گا۔

ممبئی مطبوعہ ۱۸۵۹ء میں باب (توحید) میں حضرت امام حسینؓ کے لیے یہ شعر ملتا ہے:

دشمنی حسین ازاں جستہ است کہ علی لفظ لا مکاں گفتہ است

یہاں باب توحید میں حضرت سیدنا امام عالی مقام حسینؓ کے دشمنوں کا ذکر ہے یہاں کیا معنی رکھتا ہے جب کہ ہمارے قدیم مخطوطے میں اس شعر کا پتہ نہیں۔

باب اول (توحید) میں مطبوعہ بمبئی والے نسخے میں پانچ اشعار کم نظر آئے۔ میں اپنے مخطوطے سے پانچ اشعار کا عکس دے رہا ہوں:

بلبل عشق راز کلبن چست در ترنم نوایش ای ہمہ تست

نہ خری رنگ و بوی ود مدمہ تو زیں ہمہ وار مانم ای ہمہ تست

عجز ما حجت تمامی اوست قدرتش نایب اسامی اوست

صانع و مکرم و توانا اوست واحد و کامران نہ چوں ما اوست
علی و جنبش است و تمکیں است وحدہ لا شریک لہ اینست

یہ مختصر سے اختلافات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں ورنہ اگر ہم بمبئی والے مطبوعہ ایڈیشن سے اختلافات کو سامنے لائیں تو ایک دفتر درکار ہے اور بڑے وقت کی ضرورت ہے۔
ہمارے قدیم مخطوطے میں جو دیباچہ حدیقۃ الحقیقۃ میں محمد بن علی نے لکھا اس کا طبع بمبئی ۱۸۵۹ء سے تقابل کیا جائے تو کافی فرق ہے ان تمام دلائل کے ہوتے ہوئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت حکیم سنائی کے حدیقۃ الحقیقۃ میں خوب الحاق کیا گیا ہے۔

سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کا نسخہ: سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے انگریزی فارسی مخطوطات کے کیٹلاگ میں حدیقہ سنائی کے ایک اہم نسخہ کا جلد ۴، صفحہ ۲۷ پر ذکر ملتا ہے جو ۲۷ر رمضان المبارک ۸۸۲ھ مطابق ۲ر جنوری ۱۴۷۸ء کو سلطان علی مشہدی نے بخط نستعلیق لکھا ہے یہ نسخہ بھی سنہری ہے اس پر ۸ بادشاہوں کی مہریں ثبت ہیں اس نسخہ کو ذی قعدہ ۱۱ر جلوس عالم گیری میں میرک حسین نے ایک ہزار روپے میں خریدا جس کا اشارہ مخطوطہ کے سرورق پر جلی حرفوں میں ملتا ہے اس خطی نسخہ کے سرورق پر حسب ذیل افراد کی مہریں ثبت ہیں۔ نمبر ۱: عالم گیر ۱۰۸۰ھ، نمبر ۲: عبدالرحمان بندہ شاہ جہاں، نمبر ۳: صادق از جان بندہ شاہ جہاں، نمبر ۴: میرک حسین بندہ شاہ جہاں، نمبر ۵: محی الدین علی خاں بہادر الدولہ، نمبر ۶: محمد علی شاہ جہانی، نمبر ۷: اعتماد خاں بندہ شاہ جہاں، نمبر ۸: حکیم صالح خاں مرید شاہ جہاں مرید صالح بود شاہ جہاں مرشد۔

ہمارے خرید کردہ حکیم سنائی کے حدیقۃ الحقیقۃ کا حال: ہمارا یہ خطی نسخہ بخط نستعلیق ہے اس کے کل اوراق ۳۲۰، سائز ۲۱×۱۳ سینٹی میٹر اور ۱۷ سطری، سنہ کتابت و نام کاتب ندارد ہے، اس کے سرورق پر شاہان مسلم کی کئی مہریں ثبت تھیں جن کے صرف اب نشانات باقی رہ گئے ہیں یہ کسی بدذوق و بدبخت اور کسی جاہل شخص نے ملیامیٹ کردیا ہے دیکھ کر افسوس ہوا اس میں دو روشنائی استعمال ہوئی ہیں سیاہ اور شنگرفی اس کا حاشیہ سنہری اور لاجوردی سے بنایا گیا ہے، کاغذ ہلکا بادامی گہرا رنگ اس میں دو محرابیں طلائی ہیں کاغذ میں کھر کھرا پن پیدا ہوگیا ہے چکنائی ختم ہوچکی ہے آج کے دور میں سرکاری طور پر مخطوطات کی حفاظت کے لیے جو جلد بندی ہو رہی ہے اس کے

لیے یہ مخطوطہ ترس رہا ہے۔ حدیقہ سنائی کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

صد ہزاراں ثنا چو آب زلال از رہی باور بر محمد و آل

ہمارا یہ نسخہ خطی یقیناً اور یقیناً اولیت کے شرف سے مشرف ہے جس میں انکار کی گنجائش نہیں ہے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ نسخہ چھٹی صدی ہجری کے اخیر یا ساتویں صدی ہجری کے بالکل اوائل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ دوسری اہمیت اس مخطوطے کی یہ ہے کہ اس کے اخیر میں حضرت سنائی کے دوست مولانا ابوالحسن علی بن ناصر المعروف بہ برہان الدین غزنوی کا وہ فتویٰ بھی نقل ہوا ہے جو ان کے حق میں دیا گیا ہے۔ اس دور کے علماء حضرت سنائی پر کفر کا فتویٰ دینے جا رہے تھے یہ فتویٰ کسی بھی خطی نسخہ میں نہیں پایا جاتا۔ بہرکیف جناب محمد بن علی رقائم نے بکھرے ہوئے حکیم سنائی کے کلام کو حاصل کر کے ترتیب دیا ہے۔ یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔

خط نستعلیق کے بارے میں آرا: میں نے ایک لفافہ مورخہ ۲۱ / جنوری ۲۰۰۸ء کو اپنے محسن بزرگ محترم نواب محمد رحمت اللہ خاں شیروانی مدظلہ العالی مالک مزمل لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کو اپنے خطی نسخہ حکیم سنائی کے (حدیقۃ الحقیقۃ) کی اطلاع کے لیے ارسال کیا تھا ہمارے صد لایق محترم بزرگ نواب صاحب نے اس کا جواب مورخہ ۲۴ / جنوری ۲۰۰۸ء کو بذریعہ رجسٹری ڈاک سے مجھے بھیجا۔ اس کو یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے محترم نے خط نستعلیق کے بارے میں جو لکھا ہے اس پر بحث ضروری ہوگئی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''بہت ادب سے عرض ہے کہ آپ کا مخطوطہ بھی چوں کہ نستعلیق میں ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ دسویں صدی ہجری کا ہوگا۔ یعنی نستعلیق کی ایجاد کے بعد کا''۔

محترم نواب خان بہادر کا ہی یہ خیال نہیں ہے بلکہ کچھ محقق اس طرف بھی گئے ہیں کہ خط نستعلیق کے میر علی تبریزی ہی موجد اول ہیں۔ اعجاز راہی نے اپنی تالیف ''تاریخ خطاطی'' مطبوعہ پاکستان طبع اول صفحہ ۱۱۹ پر لکھتے ہیں:

> ''خواجہ میر علی تبریزی کو خط نستعلیق کا موجد سمجھا جاتا رہا ہے مگر علامہ ابوالفضل نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ پانچویں صدی

ہجری کے ابتدائی دور میں نستعلیق کے نمونے دکھائی دیتے ہیں مگر اس سلسلے میں انہوں نے کوئی دلیل یا ثبوت پیش نہیں کیا''۔

علامہ ابوالفضل متوفی ۱۰۱۰ھ کا یہ قول ان کی آئین اکبری جلد اول ترجمہ اردو مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۱۸۸-۱۸۹ پر اس طرح ملتا ہے فرماتے ہیں:

''مشہور ہے کہ حضرت صاحب قران کے عہد حکومت میں خواجہ میر علی تبریزی نے یہ خط نسخ و تعلیق سے استخراج کیا۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے صاحب قران سے پیشتر زمانے کے چند رسالے اس خط میں اور دیکھے گئے''۔

اعجاز راہی صاحب کا یہ کہنا کہ ابوالفضل نے اس سلسلے میں کوئی دلیل نہیں دی تو کیا ابو الفضل کے اس قول کو کذب بیانی پر محمول کیا جائے؟ میرے خیال میں تو ابوالفضل کو اس سلسلے میں کوئی کذاب کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

خط نستعلیق کے بارے میں جناب سید نوشہ علی ایم - اے کا بیان ان کی کتاب ''مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم'' مطبوعہ اکیڈمی ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۵، سنہ طباعت ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۲۲ پر ہے کہ:

''خط نستعلیق کے متعلق مشہور ہے کہ دور تیموریہ میں ایک خوش خط مسمی خواجہ میر علی تبریزی نے خط نسخ اور خط تعلیق کو ملا کر ایجاد کیا۔ اسی وجہ سے اس کا نام نستعلیق رکھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ یہ خط تیمور کے زمانے سے بہت پہلے ایجاد ہو چکا تھا اس لیے خواجہ میر علی تبریزی کو اس کا موجد نہیں کہہ سکتے''۔

اس کے بعد ہم ہندوستان کے عصر حاضر کے مشہور و معروف بزرگ محقق جناب سید احمد مدظلہ العالی رام پوری کی تالیف ''خط کی کہانی تصویروں کی زبانی'' حصہ دوئم صفحہ ۱۶۹ ناشر رام پور رضا لائبریری رام پور سے یہ رائے نقل کرتے ہیں:

''نستعلیق کے موجد خواجہ میر علی تبریزی مشہور ہیں۔ یہ امیر تیمور کے عہد (۷۷۱-۸۰۱ھ) (۱۳۶۹-۱۳۹۸ء) کے نامور خطاط تھے جو فن کے اعتبار سے عدیم النظیر مانے گئے ہیں۔ لیکن علامہ ابوالفضل، دیباچہ مرقع بادشاہی (البم قطعات خوشنویسان ہند و ایران، مرتبہ شاہ جہاں گیر) میں

لکھتے ہیں کہ:

''میں نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیق کی وصلیاں دیکھی ہیں لہذا امیر علی تبریزی نستعلیق کے موجد نہیں ہوسکتے۔ ابوالفضل کی شہادت نہایت معتبر ہے۔ مولانا غلام محمد ہفت قلمی دہلوی نے اپنے ''تذکرۂ خوشنویسان'' میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ میر علی اگرچہ نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انہوں نے خط کے قواعد مرتب کیے اور نوک پلک میں خاص نزاکت پیدا کی''۔

پھر یہی مورخ ''خط کی کہانی تصویروں کی زبانی'' حصہ سوئم کے صفحہ ۸ پر تحریر فرماتے ہیں:

''دور سلاجقہ (شاخ کرمان، عراق اور ایشیائے کوچک) میں خط طی ترقی پذیر ہوئی خواجہ حسن نظام الملک طوسی وزیر ملک شاہ سلجوق متوفی ۴۸۵ھ ۱۰۹۲ء نستعلیق کے استاد تھے''۔

ابوالفضل کے مذکورہ قول کو دنیا کا کوئی بھی محقق رد کرنے کی ہمت نہ کرسکا، خط نستعلیق بادشاہ تیمور کے عہد سے بہت پہلے رائج ہوچکا تھا۔

حالات حکیم سنائی ایک نظر میں: حکیم سنائی کا اسم مبارک ابوالمجد مجدد ین بن آدم، سنائی تخلص، غزنی کے رہنے والے تھے آپ کی پیدائش ۴۳۷ھ کی ہے، وفات کے سلسلے میں کافی اختلافات ملتے ہیں، بعض مورخ ان کی وفات ۵۲۵ھ لکھتے ہیں مولانا جامی نے نفحات الانس میں بھی یہی لکھا ہے۔ مگر بعض مورخین نے یہ ثابت کیا ہے کہ حکیم سنائی نے ۵۲۸ھ میں ایک اور نسخہ لکھا تھا اس کی وجہ سے مولانا جامی کا قول رد ہوجاتا ہے مورخ پروفیسر خان صاحب و قاضی فضل حق نے اپنی تالیف ''سخنوران ایران'' کے صفحہ ۸۳ ادارہ ثقافت اسلامیہ مطبوعہ کلب روڈ لاہور میں ۵۴۵ھ بعض نے ۵۴۷ھ تحریر کیا ہے۔ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی نے ان کا وصال ۵۷۶ھ لکھا ہے۔ یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ حکیم سنائی کے نسخوں میں الحاق ملتا ہے البتہ حکیم سنائی کا یہ نسخہ ایران اور بمبئی سے بھی طبع ہوچکا ہے۔ پتہ نہیں انہوں نے کس نسخہ سے یہ بات لکھی ہے ہوسکتا ہے کہ ان مطبوعہ نسخوں میں الحاقی کلام ملا ہو۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ایک خطی نسخہ ۱۰۷۷ھ کا بھی ہے جو عہد اورنگ زیب عالم گیر کا ہے حدیقہ سنائی کی تعریف میں حضرت مولانا

جلال الدین صدیقی رومی متوفی ۶۷۲ھ نے کیا خوب کہا ہے:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پے سنائی و عطار آمدیم

مغل دور کے بعد مخطوطات اور نوادر اشیا کی صحیح پہچان کرنے والے تاجروں کی ناقدری: جناب سید نوشہ علی ایم۔اے "مسلمانان ہندو پاکستان کی تاریخ تعلیم" کے صفحہ ۲۴۴ پر مسٹر مارٹن (Mr.Martin) کا قول نقل کرتے ہیں:

"آج کل پرانی کتابوں کو جمع کرنے والے یہ شکایت کرتے ہیں کہ فارسی نسخہ جات کی قیمت کتاب فروخت کرنے والے بہت مانگتے ہیں اور کتب جمع کرنے والوں کو بہت قیمت ادا کرنی پڑتی ہے پھر بھی آج کل کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ قیمت بھی اس قیمت سے جو زمانہ قدیم میں ادا کی جاتی تھی کم ہے ایک نسخہ کے جہاں گیر نے تین ہزار سونے کے سکے ادا کیے تھے جو آج کل دس ہزار پونڈ کے مساوی ہیں۔ اگر اس نسخے کو آج کل پیرس میں نادر کتابوں میں فروخت کیا جائے تو دو ہزار پونڈ سے زیادہ نہیں ملیں گے"۔

پھر یہی مصنف منگول کے بارے میں لکھتا ہے:

"منگول آل تیمور مغل بادشاہ اور امراء اس قدر قیمتیں ادا کرتے تھے جو آج کل سمجھ میں نہیں آتیں، قرآن شریف کے اچھے قلمی نسخہ کا ہدیہ موجودہ زمانے کے حساب سے دس لاکھ فرانک تک پہنچ جاتا تھا"۔

کیا زمانہ تھا کہ مسلم بادشاہ مخطوطات کی قدر فرماتے تھے جہاں گیر بادشاہ تو نوادر فروشوں کی قدر کرتا تھا اور ان کو انعامات سے بھی نوازتا تھا آج کے دور میں نہ تو نوادر فروش کی عزت ہے اور نہ ہی نوادر اشیاء کی قدر ہے۔

ہمارے اس نسخہ دیوان حکیم سنائی معروف بہ حدیقۃ الحقیقۃ کے سلسلے میں محترم ڈاکٹر شریف حسین قاسمی کا خط مکتوبہ ۳/اپریل ۲۰۰۸ء بھی ملاحظہ فرمائیں:

۳/۴/۰۸ء

مکرمی حاجی صاحب، السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

آج ہی ''حدیقة الحقیقة'' کے ایک قدیمی قلمی نسخے کے بارے میں آپ کی فرستادہ اطلاعات ملیں۔ یہ نسخہ بہت اہم معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اس کی اہمیت پر جو روشنی ڈالی ہے، اس سے اس کی قدامت اور اس کے راسخ نسخہ ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اسے رام پور رضا کا لائبریری کی پرچیس کمیٹی کی میٹنگ میں ضرور پیش کریں گے۔ اس کی مناسب قیمت لائبریری کو ادا کرنی چاہیے۔ یہ لائبریری میں ایک اہم نسخے کی حیثیت سے محفوظ ہونا چاہیے اور اس پر تحقیقی کام کی بڑی گنجائش اور امکانات ہیں۔

والسلام

شریف حسین

نوٹ: بندہ ابھی حج کی سعادتوں سے محظوظ نہیں ہوا ہے۔ دعا فرمایئے کہ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ حقیقت میں تبدیل ہو جائیں! آمین ثم آمین۔

مولانا سعید احمد (ایم-اے) اکبر آبادی

ڈاکٹر سید اختیار جعفری

مولانا سعید احمد، اردو علم وادب اور اسلامی تحقیقات و تاریخ میں ایک منفرد نام ہے۔ مولانا ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیو بند سے فارغ ہوئے۔ اورینٹل کالج لاہور سے مولوی فاضل کیا۔ سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے کیا۔ ۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کے صدر کے منصب کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ مولانا اکبر آبادی نے کمال جدوجہد سے اپنے زمانے میں علمی اور انتظامی دونوں حیثیتوں سے اس شعبہ کو ترقی دے کر یونی ورسٹی کے دوسرے اعلیٰ معیار کے شعبوں کے برابر پہنچانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔

خاندانی حالات: مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اگرچہ میرا ددھیال بچھرایوں ضلع مراد آباد اور ننھال سیوہارہ ضلع بجنور کی ہے لیکن والد ماجد محمد ابرار حسین صاحبؒ بسلسلہ ملازمت سرکاری پہلے اتر پردیش کے مختلف شہروں میں ادھر اُدھر رہے۔ پھر آخر میں آگرہ پہنچے تو یہاں ایسے جمے کہ یہیں سے پنشن یاب ہوئے اور یہیں رہ پڑے۔ میری پیدائش آگرہ کی ہے۔ اس لیے اکبر آبادی کہلاتا ہوں''۔ اپنی نسبت اکبر آبادی کے بارے میں مولانا مرحوم نے یہ دلچسپ وضاحت کی ہے کہ ''وہ خود اپنے نام کے ساتھ کوئی نسبت نہیں لگاتے تھے۔ چنانچہ تمام اسانید، ابتدائی تصانیف اور رسالہ برہان کے پہلے صفحہ پر صرف ان کا نام مندرج ہوتا تھا۔ لیکن جب مولانا ابوالکلام آزاد نے گورنمنٹ مغربی بنگال کو کلکتہ مدرسہ کی پرنسپلی کے

راشٹریہ سہارا، ۱۸/۱۴۷، اے-۲۶، خیراتی ٹولہ، تاج گنج روڈ، آگرہ، ۲۸۲۰۰۱۔

بارے میں خط لکھا تو اس خط میں مولانا نے میرے نام کے ساتھ اکبر آبادی کا اضافہ کر دیا۔ اس کی وجہ سے تمام سرکاری کاغذات میں اکبر آبادی میرے نام کا جزء لاینفک ہو گیا"۔ نہ صرف سرکاری کاغذات میں بلکہ مولانا مرحوم کی یہ نسبت اتنی مشہور و غالب ہوئی کہ ان کا اصل نام پس منظر میں چلا گیا اور وہ اپنی نسبت سے جانے پہچانے اور پکارے جانے لگے۔ بقول ایک دانشور و عالم سعید احمد تو ہزاروں ہوں گے۔ لیکن مولانا اکبر آبادی صرف ایک ہی ہیں۔ مولانا مرحوم کی یہ انفرادیت ایسی ہے جو لاثانی ہے۔ اس کا ثبوت وہ واقعہ بھی ہے جو مولانا نے خود بیان کیا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں جب وہ کناڈا سے نیویارک گئے اور پرنسٹن یونی ورسٹی کی لائبریری کی زیارت کی تو وہاں کے لائبریرین نے ان سے ملاقات کی اور ان کی کتاب "فہم قرآن" کے مصنف کے نام کی تصدیق کر کے لوح کتاب پر ان کے نام کے آگے اکبر آبادی کا اضافہ کر دیا تا کہ خاندانی نام کی حیثیت سے مستعمل ہو۔ (برہان اگست ۱۹۸۴ء، ص: ۱۰-۹، اور جامعہ اگست ۱۹۸۵، ص: ۲۸)

مولانا بچھرایوں کے ایک معزز شیخ خاندان کے فرد تھے اور ان کا ننھالی خاندان بھی سیوہارہ کا محترم شیخ خاندان تھا۔ مشہور عالم اور تحریک آزادی ہند کے عظیم قائد مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی مولانا اکبر آبادی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ مولانا اپنی ددھیال اور اپنی ننھال دونوں خاندانوں کی روایات کے علم بردار و امین تھے۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ مولانا کے والد ماجد اور ددھیال کے دوسرے رشتہ دار بالعموم جدید تعلیم یافتہ تھے۔ جب کہ ننھال میں قدیم اسلامی تعلیم کی روایات زیادہ عام تھیں۔ قدرت الٰہی کو منظور یہ تھا کہ مولانا اکبر آبادی ان دونوں کے جامع اور جدید صالح کے علم بردار اور قدیم نافع کے امانت دار بنیں۔ مولانا اکبر آبادی کی اپنی تصریح اور خاندانی روایات اور تعلیمی و سرکاری کاغذات کے مطابق ان کی ولادت ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ مولانا نے ماہ وقت اور دن کی تصریح نہیں کی ہے۔ (برہان اگست ۱۹۸۴ء، ص: ۱۴، ۱۳، ۹)

تعلیم و تربیت: مولانا کے والد ڈاکٹر محمد ابرار حسین نے اپنے فرزند سعید کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت شاندار انتظامات کیے تھے جو ان کے عزم و حوصلہ کے غماز تو تھے ہی ان کی مذہبیت، دینی شغف اور پاکیزگی قلب و نظر کے بھی عکاس تھے۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عمومی خاندانی روایات کے برخلاف اپنے اکلوتے فرزند کو مولوی بنانے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ ان کو مرادآباد کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کرایا گیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی غرض سے ان کی والدہ ماجدہ، چھوٹی ہمشیرہ اور دونوکروں کے ساتھ ایک کرائے کے مکان میں رکھا گیا۔ یہاں ان کی تعلیم مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری صدر مدرس، مولانا محمد اسحاق کان پوری اور مولانا محمد حنیف امروہوی کی زیرنگرانی شرح جامی اور شرح وقایہ وغیرہ تک ہوئی۔ تعلیمی سال کے ختم پر مولانا چاند پوری دارالعلوم دیوبند چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے فرزند سعید کو بھی وہاں بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ مولانا اکبر آبادی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''والد صاحب نے جو اہتمام مرادآباد میں کیا تھا وہی یہاں کیا۔ مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب مرحوم مغفور کے محلّہ شاہ ابوالمعالی میں دو مکانات تھے۔ ان میں سے ایک میں وہ خود پنشن یاب ہوکر سکونت پذیر تھے دوسرا مکان والد صاحب نے حافظ صاحب سے کرائے پر لے لیا اور میرے ساتھ آگرہ کا پورا گھر بار مع دونوکروں کے اس گھر میں منتقل ہوگیا اور صرف یہی نہیں بلکہ چھ ماہ کی رخصت لے کر خود بھی دیوبند آگئے''۔

مولانا حبیب الرحمان عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ڈاکٹر صاحب سے جب کہا کہ: ''آپ لڑکے کو طالب علمی کرانے لائے ہیں یا نوابی کرانے'' تو والد صاحب نے بچہ کے لاڈ پیار سے پالے جانے اور گھر سے بے گھر نہ ہونے کا عذر پیش کر کے صرف ایک سال کی اجازت مانگی جو مل گئی۔ مفتی عتیق الرحمان عثمانی اور ان کے دیوبند میں مقیم خاندان سے قریبی تعلق کا آغاز یہیں سے ہوا۔ بقول مولانا اکبر آبادی ان کی طالب علمی کے تین دور ہیں:

> ''دور اول میں میں گوشہ نشیں رہا، گھر سے مدرسہ اور مدرسے سے گھر۔ بس یہ میری دنیا تھی۔ طلبا سے خلا ملا بالکل نہیں تھا۔ (سوائے مفتی عتیق الرحمان عثمانی کے جو ان کے اس دور کے اکلوتے دوست اور بزرگ رفیق تھے) دور ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا۔ میں نے طلبا کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کردیا''۔

پہلے سال کے خاتمے پر رمضان کی تعطیل کے بعد مولانا رشیدی کے بغلی کمرے میں قیام سے مولانا اکبر آبادی کے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو آخری بھی ہے۔ مولانا کے بقول

"یہ دور جو تین برس کی مدت پر ممتد ہے میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے کیوں کہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی اسی دور میں ہوئی۔ لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا۔ پہلے میری صحبت چند شہری طلبا کے ساتھ تھی۔ اب میں ہر وقت اساتذہ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستعد مختلف صوبوں کے طلبا کی معیت میں تھا"۔ ۱۹۲۵ء میں چار سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا اکبر آبادی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل بن کر نکلے۔

حجاز مقدس سے واپسی پر مولانا اکبر آبادی مرحوم نے دارالعلوم دیوبند پہنچ کر فنون کی تکمیل کی اور اس میں مزید دو سال لگے۔ مولانا کا اپنا بیان ہے کہ" دیوبند کے شش سالہ قیام میں بھی درس و تدریس کے علاوہ اکابر اساتذہ کی معیت و صحبت کے فیض و شرف سے باریاب رہا"۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں مولانا اکبر آبادی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) چلے گئے اور وہاں بحیثیت استاد تین برس گزارے۔ قیام ڈابھیل کے ہی زمانے میں مولانا اکبر آبادی کی شادی ان کے والد کی پھوپھی زاد بہن انور بیگم کی دختر نیک اختر اختری بیگم سے ہوئی۔ وہ کم و بیش مولانا اکبر آبادی کی رفاقت میں باون سال رہیں۔ وہ حسن ظاہری کے ساتھ جمال باطنی کی بھی پیکر تھیں۔ مذہبی فرائض کے علاوہ اوراد و وظائف، تلاوت کی پابند تھیں۔ مطالعہ مذہبی اور تاریخی کتابوں کا کرتی تھیں۔ حسن اخلاق کی مورت تھیں۔ ۱۴ر مئی ۱۹۸۰ء کو کراچی میں وفات پائی۔

ملازمت: جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں علامہ انور شاہ کشمیری اور دوسرے بزرگوں کی کشش نوجوان اکبر آبادی کو کھینچ لے گئی تھی۔ وہاں تین برس (۱۹۲۸-۳۱ء) گزار کر مولانا اکبر آبادی بطور استاد مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی ۱۹۳۱ء میں آگئے اور وہاں مولانا سید فخر الحسن الحسنی العمری جیسے اساتذہ و فضلا کے ساتھ کئی برس کام کیا۔ اسی دوران ۱۹۳۶ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونی ورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں وہ دہلی یونی ورسٹی کے ایک انتہائی باوقار کالج سینٹ اسٹیفن میں بقول مفتی عتیق الرحمان صاحب کئی بار عارضی طور پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد با قاعدہ معقول مشاہرہ پر مستقل تقرر ہو گیا۔ اس بار وہ اردو اور عربی ادبیات کے پروفیسر رہے۔ جہاں جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان (۱۹۷۷-۸۸ء) ان کے شاگرد بنے۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات ہند کی تحریک و سفارش پر مولانا اکبر آبادی کو کلکتہ کے عالی وقار اور عظیم الشان مدرسہ عالیہ کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

۱۹۵۹ء میں مولانا اکبر آبادی کو اس وقت کے وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کی سربراہی کے لیے منتخب کیا اور ان کو ایک خط کے ذریعہ منصب پیش کیا۔ مولانا مرحوم کو اس یونی ورسٹی سے بہت عقیدت ومحبت تھی اور وہ اسے ملت اسلامیہ ہند کی آبرو سمجھتے تھے۔ اس لیے مدرسہ عالیہ کے لیے حکومت بنگال کے وزیر اعلیٰ بی سی رائے اور گورنر سروجنی نائیڈو اور بہار کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین کے اصرار وکوشش کے باوجود انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ دینیات کی صدارت قبول کرلی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے استعفا دے کر علی گڑھ آگئے اور ۱۹۵۹ء میں شعبہ دینیات کے پروفیسر اور صدر بن گئے۔

مسلم یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہوتے ہی وہ تغلق آباد دہلی کے اسلامی علوم کے ادارے سے وابستہ ہوگئے اور کئی برس تک وہاں علمی کاموں کی رہنمائی کرتے رہے، وہاں کا قیام زیادہ راس نہ آیا تو وہ...... وزیٹنگ پروفیسر ہوکر کالی کٹ یونی ورسٹی چلے گئے اور کئی سال تک وہاں علمی اور تحقیقی کاموں میں منہمک اور طلبہ واساتذہ کی ذہنی وروحانی تربیت کرتے رہے۔ پھر وہ مسلم یونی ورسٹی ہی کے ادارہ علوم اسلامیہ میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے واپس آئے۔ جب دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکادمی قائم ہوئی اور اس کے ارباب حل وعقد نے اس کی بہتر کارکردگی کے لیے کسی ڈائریکٹر کی ضرورت محسوس کی تو ان کی نگہ انتخاب مولانا اکبر آبادی پر پڑی۔ سچ یہ ہے کہ اس سے بہتر انتخاب ہو نہیں سکتا تھا۔ مولانا نہ صرف اپنے علم وفضل اور وہبی صلاحیتوں کے سبب اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے بلکہ ان کو حضرت شیخ سے جو محبت وعقیدت تھی اس نے ان کا استحقاق چند دو چند کردیا تھا۔ مولانا ۲۵؍دسمبر ۱۹۸۲ء سے اپنی وفات تک اس کے ڈائریکٹر رہے۔

برہان: مختلف رسائل وجرائد میں لکھنے کے ساتھ ساتھ جولائی ۱۹۳۸ء میں مولانا اکبر آبادی کو برہان کی شکل میں ایک مستقل مرکز تحریر اور محور قلم مل گیا۔ جب ادارہ ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا اور اس کا نمائندہ رسالہ نکلنا شروع ہوا۔ اگرچہ مولانا اکبر آبادی اس سے پہلے بھی مہاجر وغیرہ کے مدیر رہ چکے اور ادارت کے تجربات حاصل کرچکے تھے لیکن یہاں سے مولانا کی علمی وتحقیقی تحریروں کا سلسلۂ سلسبیل شروع ہوا اور باوزن وباوقار ادارت کا دور منزلت بھی۔ "برہان" ان کے زیر ادارت ۱۹۳۸ء میں شروع ہوا۔ ان کا اداریہ نظرات کے نام سے بڑا مدلل، پرمغز اور فکر انگیز ہوتا۔ اس کے علاوہ متعدد

بلند پایہ اور محققانہ کتابوں کے مصنف ہوئے۔ ان کی کتابوں کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے:

فہم قرآن: فتنۂ انکار حدیث اور اس کے پردہ میں قرآن کی حیثیت و اہمیت کا انکار گزشتہ صدی کے ربع دوم کا بڑا فتنہ تھا جس نے حق پرست علماء کے لیے متعدد مسائل پیدا کر دیے۔ اس وقت مولانا اکبر آبادی نے یہ کتاب تصنیف کر کے قرآن و حدیث دونوں کی بڑی خدمت انجام دی۔ مولانا نے اس سلسلہ میں تمام قدیم و جدید نظریات کو پیش کر کے اور قرآن فہمی سے متعلق جن علوم کی واقفیت اور ان پر دست رس کی شرط ہے، ان پر دادِ تحقیق دی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالخصوص اس بات کا اہتمام رکھا ہے کہ حدیث و قرآن کے باہمی ربط کو ثابت کر کے حدیث کی شرعی حجیت واضح کی جائے۔ جس کے لیے انہوں نے مستند علمی و تاریخی دلائل پیش کیے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں تدوین حدیث، وضع حدیث جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے صحابہ کرام اور تابعین کی خدمات کا ذکر بالتفصیل کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، امام زہری اور اصحاب صحاح ستہ کی گراں قدر خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ پہلے "برہان" میں پھر کتابی شکل میں ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔

وحی الٰہی: فتنۂ انکار وحی دراصل فتنۂ انکار حدیث کی توسیع ہے۔ جب احادیث کی صحت کا انکار کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ قرآن کی حقانیت کے ابطال کی شکل میں برآمد ہوا کیونکہ قرآن دراصل احادیث روایت کرنے والے افراد کی ہی توجہ سے ہم تک پہنچا تھا۔ اس کتاب میں مولانا نے اس بات کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے کہ وحی الٰہی سے متعلق شکوک و شبہات اور کج فہمیوں کے عقلی اور نقلی جوابات فراہم کیے جائیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے وحی کی ضرورت، وحی کی اقسام، قرآن و وحی نیز وحی اور محققین یورپ جیسے موضوعات کا انتخاب کیا اور ہر موضوع کے ساتھ اپنے زوردار انداز میں مخالفین کے اعتراضات اور ان کے شبہات کے جواب اور آیات قرآنی سے ان کے من جانب اللہ ہونے کی دلیلیں دی ہیں اور "نبوت" اور "کلام الٰہی" کے اعجاز کو مدلل بیان کیا ہے۔ اس طرح کے موضوع پر لکھنے والے عام محققین کے انداز میں جو خشکی ہوتی ہے مولانا کے یہاں وہ بات نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس شگفتہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس سے قاری اور نفس موضوع میں ایک ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کی۔

صدیق اکبرؓ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت مسلمہ اور خلافت راشدہ کے

سامنے جو مسائل اور فتنے آ کھڑے ہوئے تھے، ان کا تدارک جس فراست، سیاسی بصیرت اور تدبر سے کیا گیا وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسی شخصیت سے ہی ممکن تھا۔ کیونکہ اس دور میں ایسا ہی رہنما کامیاب ہوسکتا تھا جس کی شخصیت ریشم اور فولاد دونوں سے مرکب ہو کہ زیادہ سختی امت میں انتشار کا موجب ہوتی اور بہت زیادہ نرمی سے اسلام مخالف قوتوں پر گرفت کمزور ہوجاتی۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کی ہی ذات تھی جس نے ہر آزمائش کے وقت میں اپنی قوت ایمانی اور نبی اکرمؐ کی اتباع سے امت کا شیرازہ بکھرنے سے بچالیا۔ خلافت کی مرکزیت کو برقرار رکھا۔ اور اٹھنے والے نو بہ نو فتنوں کا سدِ باب کیا۔ علامہ شبلی نعمانی حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت پر ''الفاروق'' لکھ کر دادِ تحقیق دے چکے تھے۔ مولانا اکبر آبادی نے حضرت ابوبکرؓ کی ذات مبارک پر یہ کتاب لکھ کر اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ دراصل یہ کتاب ''الفاروق'' کے سلسلے کی توسیع ہی ہے۔ جس کے ذریعہ پہلی بار اردو زبان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تمام کارنامے منظر عام پر آئے۔ چاہے وہ فتنہ ارتداد کا تدارک ہو یا شام کی سرحدوں کی طرف سے حفاظت و چوکسی، زکوٰۃ کی وصولیابی ہو یا اسلامی ریاست کی توسیع اور اس کا استحکام یا جمع قرآن کی اولین کوشش۔ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ذاتی حالات وسوانح، اخلاق و سیرت، فضل وکمال، اجتہاد وتفقہ، ان کے علمی، دینی اور سیاسی کارناموں کی تفصیل۔ تمام پہلوؤں پر اس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے کہ ہر رخ سامنے آجاتا ہے۔ یہ کتاب نہایت مبسوط محققانہ اور عہد صدیقی کا جامع مرقع ہے۔ اور الفاروق کی تصنیف کے بعد سیرۃ الصدیق کی جو کمی تھی وہ پوری ہوئی ہے۔ کتاب میں جا بجا علمی و دینی مباحث اور بعض قابل تحقیق سیاسی تاریخی مسائل پر طویل بحثیں ہیں جو نہایت قابل قدر اور فاضل مصنف کی تحقیق کے ساتھ سیاسی و تاریخ نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں ندوۃ المصنفین، دہلی نے شائع کی۔

عثمان ذوالنورینؓ: سلسلۂ خلفاء کی یہ دوسری کتاب ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی تمام تفصیلات کا احاطہ کرتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے ذاتی حالات، ان کے اخلاق وفضائل اور ان کی سخاوت کے واقعات کی تفصیل ہے۔ عہد نبوت وخلافت میں حضرت ذوالنورینؓ نے کیا خدمات انجام دیں، اسلام کے نازک دور میں کس طرح مدد دی، اسلام کی اشاعت میں حضرت عثمانؓ کا کیا کردار ہے اور ان باتوں کی قدر نبی کریمؐ کے دل میں کیا تھی، یہ تمام مباحث اس میں آگئے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے بحیثیت خلیفہ جو دینی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں، ان کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کا عہد فتنوں کی ابتداء کا عہد تھا، ان فتنوں، شورشوں اور بغاوتوں کے محرکات اور اسباب کیا تھے؟ شہادت کن حالات کا نتیجہ تھی اور کن کن ریشہ دوانیوں کا انہیں سامنا کرنا پڑا؟ یہ تمام حالات ایک مورخانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کی ترتیب میں معتبر ماخذ کا سہارا لیا گیا ہے۔ ۴۴۳ صفحات کی کتاب اپنے موضوع پر ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت: مستشرقین ایک عرصہ سے بڑے طنزیہ انداز میں یہ اعتراض کرتے رہے ہیں کہ اسلام غلامی کی رسم کے تسلسل کا حامی اور اس غیر انسانی رسم کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ان اعتراضات کے جواب دینے میں کسی قدر غیر معقول اعتذار کا عنصر شامل تھا۔ چنانچہ کئی لوگوں نے اسلام میں سرے سے اس رسم کے وجود کا انکار ثابت کرنا چاہا۔ بعض مصنفوں کا انداز معاندانہ تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے اس موضوع کا بتمام وکمال تاریخی و تحقیقی جائزہ "اسلام میں غلامی کی حقیقت" کے عنوان سے لیا۔ یہ کتاب مستشرقین کے اعتراضات کا مسکت جواب ثابت ہوئی۔ عربی اور انگریزی میں اس موضوع پر جتنا مواد تھا، مولانا نے بہ نظر غائر اس کا مطالعہ کر کے انتہائی منطقی انداز میں اس کا جائزہ لیا اور دیگر تہذیبوں اور مذاہب میں غلامی کی رسم سے بحث کر کے اس کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اجتماعی، تاریخی اور نفسیاتی و سیاسی تمام پہلوؤں کو پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ رسم ہر جگہ، ہر دور اور تہذیب میں اپنی بدترین صورت میں موجود تھی۔ یہ اسلام کی انسان نوازی تھی کہ اس نے اس رسم کو کم کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ پابندیاں لگائیں۔ ایسا ضابطہ اخلاق مرتب کیا جس سے اس رسم کی ہمت افزائی نہ ہو سکی۔ اور بتدریج اس کا وجود ہی مٹ گیا۔ اس نے غلاموں کی آزادی کی ترغیب دلا کر ان کا درجہ بلند کیا اور مساوی حقوق دے کر ان کی سماجی حیثیت بدل دی۔ اس ضمن میں مولانا نے صنعتی انقلاب اور یورپ کی پیدا کردہ معاشی اور سیاسی غلامی سے بھی بحث کی ہے اور ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں اس سے پہلے ایسی کوئی جامع و مانع کتاب نہیں تھی۔ اس کتاب نے ایک زبردست کمی پوری کر دی۔ مولانا اکبر آبادی کی بحث کا طریقہ بہت مدلل اور منطقی ہے اور جیسا کہ ہم مولانا کے سلسلے میں پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ان کا انداز قدیم و جدید دونوں کا ایک حسین امتزاج ہے۔ قدیم مصادر کے ساتھ جدید ماخذ، و جدید رجحانات سے

واقفیت اس کی بڑی خوبی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔

غلامان اسلام: یہ کتاب مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کتاب ''اسلام میں غلامی کی حقیقت'' کا دوسرا حصہ ہے اور اس کا تتمہ بھی۔ اسلام نے غلاموں کو جو مساویانہ حقوق دیے ہیں، یہ ان ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں چاہے وہ سیاسی ہو، تاریخی ہو، اجتماعی ہو، ثقافتی ہو یا علمی ہو، ہم کو ایسے نام مل جاتے ہیں جو تھے تو غلام لیکن اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ سے ان کو وہی درجہ دیا گیا جو ایک آزاد مسلمان کو حاصل تھا۔ چنانچہ اس طبقہ سے تاریخ اسلام میں جو نمایاں نام ہیں، ان میں عباد و زہاد، شاعر و ادیب، فقیہ و عالم، صاحبان تخت و تاج غرض کہ ہر شعبہ حیات میں بڑے نام مل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیق و جستجو کے بعد مصنف نے نمایاں افراد کی ایک فہرست میں صحابہ و تابعین، تبع تابعین، فقہاء، صوفیاء، شعراء، امراء اور مغنیوں کے نام اور بعض حضرات کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس میں بھی مولانا کی روایتی تحقیقی شان نمایاں ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک شافی جواب کی حیثیت رکھتی ہے، جو اسلام پر اس سلسلے میں لغو اور بے بنیاد اعتراض کرتے اور اپنی کم علمی کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے اس غیر انسانی رسم کی ہمت افزائی کی ہے۔ کتاب کی زبان اور مصنف کا اسلوب عام فہم اور سادہ ہے۔ یہ ندوۃ المصنفین دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔

مسلمانوں کا عروج و زوال: یہ داستان ایسی قوم کی ہے جس نے قلیل مدت میں دنیا کی مضبوط ترین اور ناقابل شکست حکومتوں کو زیر کر لیا تھا اور ایک صدی کے اندر اندر ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں پر چھا گئی تھی۔ ساتھ ہی یورپ کے ایک حصے کو بھی زیر نگیں کر لیا تھا۔ مصنف نے خلافت راشدہ، بنو امیہ، بنو عباس، اندلس، آل عثمان اور ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے عروج کی داستان ایک باشعور مورخ کی حیثیت سے پیش کی ہے۔ تہذیبی اور تمدنی کارنامے بیان کیے ہیں۔ ان کے زوال کا المیہ سنایا ہے۔ ان کے زوال کے اسباب اور نتائج سے بحث کی ہے۔ کتاب میں کل ۳۴۷ صفحات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار سال پر مشتمل اس تاریخ کے لیے ۳۴۷ صفحات ناکافی ہیں لیکن مصنف نے اختصار کے ساتھ جامعیت سے یہ فرض انجام دیا۔ ندوۃ المصنفین دہلی سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔

کتاب دینیات: یہ کتاب مولانا اکبر آبادی نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے طلباء کے لیے مرتب کی تھی۔ اسے یونی ورسٹی نے بی اے، بی کام اور بی ایس سی کے طلباء کے لیے لازمی دینیات کی حیثیت

سے منظور کیا تھا۔ اس کتاب کو ۱۹۶۰ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے چھوٹی تقطیع کے ۲۴۲ صفحات میں شائع کیا۔ اس کتاب میں مولانا نے عقائد، وحی اور کتب الٰہیہ، اسلام کے اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور روحانی نظام پر بہترین مواد پیش کیا ہے۔ کہیں بھی تحقیق اور معیار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ہے۔ اصل آیات واحادیث نقل کرنے کے بعد تشریح کی گئی ہے اور عقائد کی دلکش بحث کی ہے۔

اسلامی عبادات اور اخلاقی تعلیمات: یہ کتاب عام اور کم تعلیم یافتہ عوام کے لیے ہے۔ اس میں مولانا نے عبادات کے مفہوم، ارکان اسلام کی تشریح، کلمہ کا مطلب، نماز کے اوقات و مسائل، وضو و غسل کے طریقے، فرائض، سنتیں، نماز کے طریقے، دعائیں، بیمار و مسافر وغیرہ کی نماز، جمعہ، عیدین، وتر، سجدۂ سہو، روزہ، اعتکاف، صدقۂ فطر، زکوۃ، عُشر، حج کے علاوہ دیانت داری، امانت داری، عفوو درگزر، ماں باپ کی فرماں برداری، عزیزوں و پڑوسیوں کے حقوق اور منکر چیزوں وغیرہ کو نہایت آسان زبان میں بیان کیا ہے۔ ۹۵ صفحات کی اس چھوٹی تقطیع کی کتاب کو ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔

نفثۃ الصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت: اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں نفثۃ الصدور کے نام سے امام رازی کی ایک مختصر کتاب شامل ہے۔ یہ دراصل ایک فارسی مخطوطہ ہے جو مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے اور مولانا کی تصریح کے مطابق یہ تحریر امام رازی کے صاحبزادے کے انتقال کے بعد ان کے ایک دوست بادشاہ نے جو تعزیت نامہ لکھا تھا اس کا جواب ہے۔ اصلاً یہ رسالہ ۹ صفحات کا ہے۔ اس کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ اس رسالے کا ذکر امام رازی کی دیگر تصنیفات میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ رسالہ دس فصول میں منقسم ہے۔ مولانا نے اس فارسی رسالہ کا مکمل متن اور اس پر طویل تحقیقی بحث نذر عرشی کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب میں پورا مقالہ شامل ہے، صفحہ ۱۳۱ سے اصل کتاب ''ہندوستان کی شرعی حیثیت'' شروع ہوتی ہے۔

یہ دراصل علامہ انور شاہ کشمیری کے ایک فتوی نما فارسی کتابچہ کا جائزہ ہے۔ اس پر مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب امیر شریعت بہار نے ڈیڑھ صفحہ کی تقریب لکھی ہے۔ اصل رسالہ میں علامہ کشمیری کے ہندوستان کے متعلق دار الحرب ہونے کا فتوی دیا گیا ہے۔ فتوی پر شاہ کشمیری کا

نام تو درج نہیں لیکن منت اللہ رحمانی مونگیری نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے علامہ انور شاہ کشمیری کا ہی فتوی قرار دیا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس پر دو طرح سے بحث کی ہے۔ پہلے جزء میں زیر بحث تحریر سے متعلق گفتگو ہے اور دوسرے میں ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق بحث ہے۔ رسالہ سے بحث کرتے ہوئے مولانا نے اس رسالہ کا انتساب علامہ انور شاہ کشمیری سے بالکل غلط قرار دیا ہے۔ اور شواہد و دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ رسالہ دراصل حضرت رشید احمد گنگوہی کا فتوی ہے۔ جسے اصل مسودہ سے علامہ کشمیری نے نقل کیا ہے۔ محض نقل کر لینے سے یہ فتوی علامہ کشمیری کا نہیں ہو جاتا۔ پھر یہ کہ یہ رسالہ پہلے بھی مفتی محمد شفیع اپنے ترجمہ کے ساتھ ۱۳۵۲ھ میں مکتبہ دار التبلیغ دیوبند سے شائع کر چکے ہیں۔ مولانا نے علامہ کشمیری کے اصل خیالات کو پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ دار الامن بلکہ زیادہ صحیح اور فقہاء کی اصطلاح میں دار العہد تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا اکبرآبادی نے ۱۹ویں صدی کے سیاسی حالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایک دوسرے فتوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا سید احمد شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبدالحئی لکھنوی، مولوی نذیر احمد اور فرنگی محل و دہلی کے فتاوی کی روشنی میں دار الاسلام، دار الامن، دار الحرب اور دار العہد کی اصطلاحات کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا اکبرآبادی نے آزاد ہندوستان کے نظام، سیکولرازم، آئین، جمہوریت، سپریم کورٹ، مذہبی آزادی، تقریر و تحریر اور معاشی آزادیوں کو پیش نظر رکھ کر مندرجہ ذیل نتائج نکالے ہیں:

۱- ہندوستان چونکہ ایک سیکولر جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے۔ اس بناء پر فقہاء کی اصطلاح میں غلبۂ کفر یہاں صادق نہیں آتا۔ ۲- شہری حقوق میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔ ۳- مذہبی آزادی کی دفعہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ۴- مسلمانوں کو معاشی و تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔ ۵- انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات اسلامی ملکوں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں۔ ۶- انڈین یونین کی شمال مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے۔ لاہور سے لے کر مراکش تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے۔

ان تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ دار الحرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ ''استیلاء'' میں جمع ہو گئے ہیں ان میں سے چونکہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی اس لیے ہندوستان دار الحرب نہیں ہے اور نہ اس جیسا کوئی اور جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو دار الحرب ہو سکتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد: مولانا نے حضرت عبید اللہ سندھی پر ''برہان'' اور ''معارف'' کے لیے کئی مضامین میں مولانا سندھی کے ناقدین کے بعض اعتراضات کا جائزہ لیا تھا۔ ان مقالات کو ترتیب نو اور مفید اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں سندھ ساگر اکیڈمی لاہور نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا اکبر آبادی شروع سے متاثر تھے۔ ان کے بعض مضامین الہلال والبلاغ میں طبع بھی ہوئے تھے۔ مولانا نے مولانا آزاد کی سیرت و شخصیت اور ان کی علمی و عملی جدوجہد پر ''برہان''، ''معارف'' اور دوسرے رسائل میں کئی مضامین لکھے۔ انجمن خدام القرآن لاہور میں ایک طویل خطبہ بھی دیا تھا جو انجمن کے ترجمان ''حکمت القرآن'' میں شائع بھی ہوا۔ ان تحریروں کو ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مرتب کر کے ''مولانا ابوالکلام آزاد: سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے'' کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی اکیڈمی کراچی سے شائع کیا۔ مرتب نے مولانا اکبر آبادی کے مختصر سوانح بھی دیے۔

خطبات اقبال پر ایک نظر: یہ مولانا کی آخری کتاب ہے، جو دراصل ان خطبات پر مشتمل ہے جو انہوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کشمیر کی دعوت پر دیے تھے۔ اسی انسٹی ٹیوٹ نے ان مقالات کا مجموعہ ۱۹۸۹ء میں کتابی شکل میں کافی اہتمام سے شائع کیا۔

چار علمی مقالات: اس کتاب کی تفصیلات نہ مل سکیں لیکن اس کتاب کا تذکرہ ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی چیئرمین فیکلٹی آف علوم اسلامیہ علی گڑھ یونی ورسٹی نے فکر و نظر میں شائع اپنے مضمون میں کیا ہے۔ یہ کتاب یونی ورسٹی نے ۱۹۷۶ء میں شائع کی تھی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نہ صرف ایک بلند پایہ عالم اور نکتہ سنج ادیب تھے بلکہ شاعر بھی تھے۔ مگر بقول خود ان کے کہ ایک مرتبہ اپنے ابتدائی دور میں جبکہ میرے ارزاں قسم کے مضامین و

مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے، ایک نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف جیسے معیاری رسالہ کے معیار کے لائق ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں ارسال کردی۔ مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت وشفقت کے ساتھ تحریر فرمایا "آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ یہ آپ کے مرتبے سے گری ہوئی چیز ہے۔ کچھ محنت کیجئے اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے۔ قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہوسکتی ہے اور یہی ہونی چاہیے"۔ مولانا موصوف پر اس خط کا یہ ردعمل ہوا کہ بقول ان کے "مولانا کے گرامی نامے کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا:

کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم علت کھل گئی

مولانا کی ۴ غزلیں جولائی ۱۹۳۱ء (یا ۳۸ یا ۳۹ء ہے) میں، نومبر ۱۹۴۴ء، دسمبر ۱۹۵۲ء، اگست ۱۹۵۷ء میں چھپیں۔

نمونہ تحریر: نظرات میں اسلام اور خواتین کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عورتوں کے متعلق کثرت سے ایسی احادیث بھی مسلمانوں میں مشہور ہیں جن سے عورت کی تنقیص نکلتی ہے۔ یہ روایتیں محدثین کے نزدیک من گھڑت اور موضوع ہیں۔ علامہ ابن جوزی، ملا علی قاری اور محمد طاہر حنفی نے موضوعات پر اپنی کتابوں میں ان احادیث پر سخت تنقید اور جرح کرکے ثابت کیا ہے کہ یہ روایات موضوع اور ناقابل قبول ہیں۔ ان سب روایات کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک روایت لیجئے۔ کہا گیا ہے کہ عورتیں دین اور عقل دونوں اعتبار سے ناقص ہوتی ہیں۔ ان سے مشورہ مت کرو۔ ملا علی قاری الہروی (م ۱۰۱۶ھ) نے کتاب المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع کے نام سے لکھی، جس کو عہد حاضر کے بلند پایہ عالم اور محدث شیخ ابوالفتح ابوغدہ مصری نے بڑی محنت اور تحقیق سے ایڈٹ کیا اور چھاپا ہے۔ اس کتاب میں مذکورہ بالا روایت پر مفصل کلام کرکے اسے موضوع ثابت کیا ہے۔ شیخ ابوالفتح ابوغدہ اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (ص ۸۵) روایت میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ عورتیں دین میں ناقص ہیں اور دوسری یہ کہ کم عقل ہیں اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ پہلی بات اس لیے غلط ہے کہ عورتوں کے ناقص فی الدین ہونے کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ماہواری ایام میں نماز نہیں پڑھتیں۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ عورتیں شریعت کے حکم سے جب ایسا کرتی ہیں تو پھر

ان کا دین ناقص کیسے ہوا۔ رہی دوسری بات تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ اپنی ازواج مطہرات سے مشورہ لیتے تھے۔ اگر عورتیں کم عقل ہوتیں اور اس لیے ان سے مشورہ کرنا ممنوع ہوتا تو حضورؐ مشورہ کیوں لیتے''؟ (برہان، ج ۹۷، ش ۶، دسمبر ۱۹۸۳ء، نظرات)

تبصروں کے نمونے: انشائے بے خبر از مفتی شہاب اللہ انتظام الشہابی اکبر آبادی۔ تقطیع خورد، صفحات ۱۰۴، مرتضائی پریس آگرہ۔ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''خواجہ غلام غوث بے خبر مرزا غالب کے ہم عصروں میں تھے۔ اردو نثر بہت عمدہ لکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے مگر زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ انہوں نے ۱۸۴۰ء میں اردو نثر نگاری اور اردو میں خطوط نویسی کی طرف توجہ کی تو ایسے گل کھلائے کہ اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں طرز انشاء کے مالک ہوگئے۔ مرزا غالب کا کوئی خط اردو میں ۱۸۵۰ء سے پہلے کا اب تک نہیں ملا ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ بے خبر کو مرزا پر فوقیت حاصل ہے اور جہاں تک ان کی انشاء کا تعلق ہے اس میں وہ مرزا کے ہم نشیں نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط کے تین مجموعے ''فغانِ بے خبر، خوں نابۂ جگر اور رشک لعل و گہر'' کے نام سے مدت ہوئی شائع ہو چکے ہیں لیکن ان خطوط کے علاوہ بھی چند خطوط اور اردو میں بعض تحریریں ایسی تھیں جو کتابی شکل میں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے ان خطوط کو اردو میں شائع کرکے اردو ادب کے خزانے میں چند انمول ہیروں کا مزید اضافہ کیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اب سے ستر اسی برس پہلے بھی خواجہ بے خبر کس طرح ایسی صاف، سلیس اور شستہ و رواں اردو لکھتے تھے کہ وہ بالکل نکھری ہوئی اور ترقی یافتہ آج کی زبان معلوم ہوئی ہے۔ کتاب کے شروع میں بے خبر کے ذاتی سوانح، اخلاق و عادات اور ان کے خصائل و کمال پر ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں ان کی اشاریہ کی خصوصیات پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اس کے بعد چند متعلقہ حضرات کا مختصر سوانحی خاکہ ہے۔ پھر اصل رقعات شروع ہوجاتے ہیں۔ مرزا غالب کے خطوط کی طرح یہ خطوط بھی دو طرح کے ہیں: ایک وہ جن میں عربی و فارسی تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کی کثرت سے کمال انشاء کی داد دی گئی ہے۔ دوسری قسم کے خطوط وہ ہیں جو نہایت سادہ و بے تکلف اور مکالمے کے

انداز میں تحریر کیے گئے ہیں"۔(برہان، ج ۵، ش ۲، رجب ۱۳۵۹ھ/جولائی ۱۹۴۰ء)

میلاد شریف منظوم: مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی تقطیع خورد، ص ۴۰، مصطفائی بک ڈپو ڈیوڑھی بیگم آگرہ۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"غلام امام شہید مرزا غالب کے ہم عصر اور اردو فارسی کے پرگو باکمال شاعر تھے۔ ان کی خوبیوں پر مستزاد یہ کہ صاحب باطن بزرگ تھے۔ عشق و محبت رسول اللہؐ میں ان کی شیفتگی، فدائیت اس درجہ پر تھی کہ بجز نعت لکھنے اور پڑھنے کے کوئی شغل ہی نہیں تھا۔ اسی سبب سے مداح نبی اور عاشق رسول کے مبارک القاب سے مشہور تھے۔ اسی عشق و محبت کے عالم میں انہوں نے ایک منظوم میلاد نامہ لکھا تھا جس میں متعدد نعتیہ قصیدے، غزلیں اور بحر طویل میں کئی نظمیں شامل ہیں۔ اب مفتی صاحب نے میلاد نامے میں حضرت شہید کی دو اور نظمیں شامل کر کے اس کو افادۂ عام کے خیال سے شائع کیا ہے اور مقدمہ لکھا ہے۔ میلاد نامے کے ایک ایک شعر سے عشق رسول کا اظہار ہوتا ہے اور یوں بھی زبان فصاحت و بلاغت بیان اور قدرت کلام کے اعتبار سے اس کو اردو ادب کا نادرۂ روزگار شاہکار کہہ سکتے ہیں"۔

لالہ رُخ ترجمہ ازل-احمد اکبر آبادی: اس کتاب پر مولانا اکبر آبادی کا تبصرہ:

"یہ انگریزی ادب کی مشہور ترین مثنوی ہے جو ٹامس مور کی ۳۰ برسوں کی مشق نگارش کا بہترین نتیجہ ہے اور انشائے لطیف کا نادر نمونہ۔ اس کے حقوق اشاعت پہلی بار ۳ ہزار گنا رقم دے کر حاصل کیے گئے تھے۔ مغربی ادبیات میں تخیل شعر کی سحر کارانہ رنگ آفرینیوں کے پیش نظر جن کتابوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، یہ ان میں ایک بہترین اور نمایاں توجہ لیے ہوئے ہے۔ اس مثنوی کی بنیاد ان ایشیائی تصورات پر ہے جنہیں الفاظ کا پیراہن پہنا دینے کے بعد صرف "شاعری" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ۴ قصے ہیں جو واقعیت کے لحاظ سے سرتاپا "الف لیلہ"، "طلسم ہوش رُبا"، "داستان امیر حمزہ"، "فسانۂ عجائب" جیسے لٹریچر میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان میں "آتش پرستان فارس" دوسرے قصوں سے زیادہ اچھا ہے۔ بقول نیاز فتح پوری "اکتشافات ادبیہ" میں سے ہیں۔ ل-احمد۔ (لیکن یہ واقعہ ہے کہ نگار کی شہرت و مقبولیت میں خود لطیف جس کا بہت بڑا حصہ ہے) لالہ رخ نگار کے ابتدائی پرچوں میں

بالاقساط شائع ہوچکی ہے اور لطیف صاحب کا ترجمہ اصل سے کسی بھی حیثیت سے کم نہیں۔ تخیل کی وہی نزاکتیں، انداز بیان کی وہی شیرینی ولطافت، کیفیات کی ترجمانی کے لیے اسی قسم کے سرشارانہ الفاظ۔ غرض سب کچھ اصل کے ہم پایہ اردو ترجمہ میں موجود ہے۔ دراں حالانکہ یہ نثر کا نہیں نظم کا ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اصل کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھتے ہوئے کامیابی حاصل کرلینا کوئی سہل کام نہیں۔ لیکن لطیف احمد مثنوی کے ترجمے کی ہر ایک پیچیدہ ونازک وادی سے بہت خوبی کے ساتھ گزرے ہیں اوران کی اس خوبصورت روانی میں کہیں بھی کوئی تھکاوٹ یا لغزش محسوس نہیں ہوتی۔ اگرچہ انہیں اس مرحلے کو طے کرنے کے لیے بیشتر تصرفات سے کام لینا پڑا ہے۔ کتاب میں متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات ۲۲۱، کتب خانہ علم وادب دہلی"۔ (برہان، ج ۴، ربیع الاول ۱۳۵۹ھ/اپریل ۱۹۴۰ء)

حوالے

(۱) مصنف کی تصنیفات: وحی الٰہی، نفثۃ الصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، غلامانِ اسلام۔ (۲) ڈاکٹر ٹیلین مظہر صدیقی: فکرونظر (ناموران علی گڑھ کا تیسرا کارواں، ج ۲)، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۷ ۳۴، ۳۳۱۔ (۳) برہان اگست ۸۴، مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی۔ (۴) جامعہ اگست ۸۵، ص ۲۸۔ (۵) برہان نومبر ۱۹۸۴ء، ص ۱۳، مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی، ص ۳۔ (۶) برہان دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۵، ۴۔ (۷) برہان جون ۱۹۸۰ء، ص ۶۴۔ (۸) برہان اکتوبر ۱۹۸۴ء، ص ۱۰، ۵، مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی، ص ۲۔ (۹) برہان جون ۱۹۸۰ء، ص ۶، ۲۔ (۱۰) برہان جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۵، ۲۔ (۱۱) برہان اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۳، ۲۔ (۱۲) برہان نومبر ۱۹۴۳ء، ص ۳۲۲۔ ۳۲۲۔ (۱۳) برہان دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۷، ۲، نظرات.. (۱۴) معارف جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۷۵، ۵۷۔ (۱۵) برہان جون ۱۹۸۴ء۔ (۱۶) معارف جون ۱۹۸۵ء، ص ۴۶۱۔ (۱۷) جون ۱۹۸۵ء، ص ۲، برہان اگست ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۔ (۱۸) جمیل مہدی برہان کی خصوصی اشاعت، مفتی عتیق الرحمان عثمانی نمبر۔ (۱۹) مولانا اکبر آبادی مرحوم اور برہان: مسعود انور علوی کاکوروی؛ ماہنامہ برہان ج ۹۸، ش ۲، ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ/اگست ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۔

اخبار علمیہ

دارالمصنفین قلت وسائل کے سبب اہم مراجع و مآخذ کے جدید ترین ایڈیشنوں اور عصری موضوعات پر عالم عرب کی بہترین کتابوں سے محروم ہے، موقر عربی رسایل و جراید بھی یہاں نہیں آپاتے، لیکن گذشتہ دنوں سعودی سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی ڈاکٹر ابراہیم محمد البطشان شبلی اکیڈمی تشریف لائے تو انہوں نے متعدد موضوعات پر مشتمل تقریباً پچاس عربی مطبوعات ادارہ کو ہدیۃً بھیج کر علمی قدردانی کا ثبوت دیا۔ اسی ہدیہ میں قرآنیات سے متعلق درج ذیل کتابیں ہیں: نواسخ القرآن مصنفہ ابن الجوزی، تحقیق محمد اشرف علی الملباری (دو جلدیں)، الامثال القرآنیہ مصنفہ عبداللہ بن عبدالرحمان الجربوع (دو جلد)، اخبار الامم المبادہ فی القرآن، عاتق بن غیث البلادی، مصطلحات القرآن، عرض و تحلیل و استدراک، ڈاکٹر سلیمان بن صالح القرماوس، اعراب الشترک من حروف المعانی فی القرآن الکریم، اعداد علی بن ابراہیم الناجی۔

سعودی عرب کو عام طور سے قدامت پسند ملک سمجھا جاتا ہے، لیکن گذشتہ دس برسوں سے وہاں سماجی اور تعلیمی اصلاحات کا عمل جاری ہے، حال ہی میں وہاں کی تعلیم یافتہ خواتین کے ایک وفد نے پیرس جاکر جس عزت نفس اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا، اس سے صاف طور پر سعودی خواتین میں انقلاب کی آہٹ محسوس ہورہی ہے، رپورٹ کے مطابق وہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریؓ کو اپنا آئیڈیل مان کر تجارت، تدریس، سائنس اور سماجیات کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کی خواہاں ہیں اور ترقی یافتہ ممالک کی خواتین کی طرح خود کو متعارف کرانے کی خواہش ان کے دل میں بھی کروٹ لے رہی ہیں، وفد کی ایک رکن لامہ السلیمانی نے بایو کیمسٹری میں سند حاصل کی ہے اور وہ چیمبرس آف کامرس کی مجلس عاملہ کی پہلی خاتون رکن اور سعودی فرانس بینک بورڈ کی رکن ہیں۔ عربی کے ساتھ فصیح فرنچ زبان بھی بولتی اور سمجھتی ہیں، شہزادی عدیلہ ایک بڑی اسکالر اور حقوق نسواں کی علم بردار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ وفد نے درآمد اور برآمد کے معاملے میں کئی بار حضرت خدیجۃ الکبریؓ کی تجارتی پالیسیوں کا ذکر کیا۔

انہوں نے اسلامی شناخت کو باقی رکھنے اور اسلام کے قرنِ اول کو سامنے رکھ کر زندگی گذارنے پر زور دیا اور کہا کہ اس سمت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے نقوش قدم کی پیری ہمارے لیے بڑی سعادت ہے، انہوں نے کہا کہ قرن اول کے معاشرے میں خواتین کو پردہ میں رہ کر نقل وحرکت کی مکمل آزادی تھی، انہوں نے کہا کہ حجاب یا برقعہ فرانس جیسے مغربی ملکوں میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے یا نہ بنے مسلم ملکوں میں یہ بہر حال رکاوٹ نہیں۔ فرانس کی اعلیٰ عہدے دار خواتین سے ملاقات کے دوران انہوں بتایا کہ لیبر قوانین میں دفعہ ۱۶۰ جس کے تحت کام کی جگہوں پر مرد وخواتین کے اختلاط پر پابندی تھی ختم کر دی گئی ہے، پہلے وہاں خواتین کے کام کی شرح ۲۰۰ر میں ۱۷ر فیصد تھی جواب بڑھ کر ۲۰ فیصد تک پہنچ گئی ہے، نوریہ الفائزہ جن کی تعلیم امریکہ میں ہوئی ہے، سعودی عرب کی پہلی خاتون ڈپٹی منسٹر اور تعلیم نسواں کی ذمہ دار ہیں۔ سعودی عرب کی خواتین کا یہ رخ، مغرب کی عریانیت زدہ، مساوات نسواں کے لیے دراصل ایک آئینہ ہے۔

گلف ڈیلی نیوز کی اطلاع کے مطابق "خطہ عرب کے لیے ترقیاتی چیلنج اور طریقہ ارتقا" کے موضوع پر شائع کی گئی دو جلدوں پر مشتمل کتابوں میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ بیس سال کے دوران غریبی کی شرح میں بجائے کمی کے بعض ملکوں میں اضافہ ہی ہوا ہے اور دنیا بھر میں بے روزگار نوجوانوں کی سب سے بڑی تعداد عرب ملکوں میں ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یمن، سوڈان اور صومالیہ جیسے ممالک اگرچہ اپنی زمینوں کی زرخیزی وشادابی کو مزید بڑھانا چاہتے ہیں لیکن بے روزگاری، سامان تغذیہ کی کمی اور امیری وغریبی کی وسیع چیلنج کے سبب وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے اگر اقوام متحدہ کی "ملینیم مہم" کا خواب جس کے تحت ۲۰۱۵ تک غربت کی سطح کو نصف حد تک کم کرنا ہے۔ شرمندۂ تعبیر کرنا ہے تو اس مسئلہ کی جانب خصوصی توجہ دینا ہوگی، خلیجی ممالک کے ساتھ ساتھ خود اقوام متحدہ کو پیش قدمی کرنا ہوگی اور جنگ وقحط جیسے مسائل کی وجہ سے ترک وطن کرنے والوں کو زندگی گزارنے کی ضروریات کا انتظام کرنا ہوگا۔

عرب نیوز کی اطلاع ہے کہ نئے ہجری سال کے آغاز پر سعودی عرب نے ۴ر نئے سعودی ٹی وی چینل اور ۱۵ر ایف ایم ریڈیو اسٹیشن شروع کرنے کا پروگرام بنایا ہے جن میں دو ٹی وی چینل قرآن اور سنت کی نشر واشاعت کے لیے خاص ہوں گے اور دو پر ثقافتی اور تجارتی پروگرام پیش

کیے جائیں گے، حکمراں شاہ عبداللہ کی ہدایت پر یہ قدم اٹھایا گیا ہے، جس سے ان کی فکر اور جدید تقاضوں کی اہمیت کو سمجھنے کی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔

امریکی رسالہ ''سائنس'' کے مطابق ہارورڈ یونی ورسٹی کے دو نوجوان محققین پیٹر لو اور پال سٹائن ہارٹ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ مسلمان نقاشی، ریاضی اور ہندسہ کے پیچیدہ اصولوں سے مغربی دنیا سے پانچ صدی قبل ہی روشناس ہو چکے تھے، جیومٹری کی مدد سے وہ فنی لحاظ سے بے عیب نقش و نگار تیار کرنے میں مہارت رکھتے تھے، ان کے مطابق سادہ نمونوں کے لیے گولہ پرکار اور پیمانے سے مدد لی جاسکتی ہے، ان آلات کی مدد کے بغیر پیچیدہ شکلوں کو کاغذ اور دیوار وغیرہ پر اتارنا ناممکن ہے لیکن پانچ صدی قبل مسلمانوں کے ذریعہ جو دیوار اور کاغذ پر تیار کیے گئے منقش نمونے آج بھی بے عیب نظر آتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان ماہروں نے پانچ صدی قبل اس فن میں نئی دریافتیں کی تھیں، واضح رہے کہ سر راجر پین روز نے ۱۹۷۰ء میں کے عشرے میں جیومٹری کا ایک ایسا نمونہ دریافت کیا تھا جس سے بغیر دہرائے بڑے نقوش تیار کیے جاسکتے تھے۔

استنبول یونی ورسٹی کے شعبۂ ادبیات نے السنۂ شرقیہ اور ادبیات پر اپنے بین الاقوامی مذاکروں کے سلسلہ کا دوسرا مذاکرہ ''شاعر دانائے مشرق-محمد اقبال'' کے موضوع پر منعقد کیا، اس کے اہتمام میں (IRCICA) کے علاوہ مرکز برائے مطالعہ اسلام (اسام)، مرکز تحقیق برائے جنوبی ایشیا (گسام) اور استنبول کے متعدد تحقیقی اور اشاعتی اداروں نے حصہ لیا، مذاکرہ میں جرمنی، امریکہ، برطانیہ، ترکی، ایران، پاکستان اور ہندوستان کے بتیس فضلاء نے فکر و شعر اقبال کے مختلف پہلوؤں جیسے اقبال کا تصور جہد مسلسل، اقبال اور ملا سودا، اقبال شاعر مشرق، ایک نیا جائزہ، چہ باید کرد وغیرہ پر مقالے پیش کیے۔

چین کے مشہور سائنس داں پروفیسر این ژانگ چوی کو حیات افزا ٹیکنالوجی، کلوننگ اور صحت عامہ کے شعبوں میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں یونیسکو نے بوعلی سینا ایوارڈ ۲۰۰۹ء کے لیے منتخب کیا ہے۔

ک، ص اصلاحی

مطبوعات جدیدہ

استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ: از مولانا نورالحسن راشد

کاندھلوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۶۲۴، قیمت ۳۰۰ روپے،

پتہ: حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر ۲۴۷۷۷۵۔

دارالعلوم دیوبند کے ذکر میں تعلیم کے ساتھ اس کی روحانی تربیت کا بیان آہی جاتا ہے، روحانی برکات کا سرچشمہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی ذات گرامی ہے تو علمی فیضان کا سرآغاز مولانا مملوک العلی کی شخصیت قرار دی جاتی ہے، لیکن خود دیوبند کے علمی حلقوں میں یہ احساس رہا کہ مولانا مملوک العلی کا ذکر خیر نسبتاً کم رہا، یہی احساس زیر نظر ضخیم و مبسوط تالیف کا سبب بنا اور حق یہ ہے کہ فاضل مصنف نے یہ حق ادا کردیا، ان کی شہرت اور قدر ایک محنتی اور دیانت دار محقق کی حیثیت سے ہے اس کتاب میں بھی یہی خوبیاں نمایاں ہیں، یہ محض ایک اہم شخصیت کے نام نیک کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش ہی نہیں، ایک عہد اور وہ بھی انیسویں صدی کے نہایت پرآشوب وقت کی تاریخ ہے، مغل حکومت بلکہ اسلامی ہند کے زوال اور استعمار مغرب کے استحکام اور عروج کے اس عہد میں جن علماء نے ہند اسلامی تہذیب اور مشرقی قدروں کی حفاظت کے لیے تعلیم کے میدان میں گویا فریضہ جہاد ادا کیا اور بقول شمس الرحمان فاروقی ''زیست باہمی کی صورتیں'' نکالیں، ان میں اسی کتاب کے صاحب سوانح کو امتیازی شان حاصل ہے، شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد اور مولانا نانوتوی و گنگوہی اور منشی ذکاءاللہ و ڈپٹی نذیر احمد کا استاد ہونا بجائے خود ایک افتخار ہے، وہ دہلی کالج میں برسوں تعلیم کی دولت عام کرتے رہے، پروفیسر اسپرنگر سے خط و کتابت رہی، ایسی عہد ساز شخصیت پر واقعی کم لکھا گیا اور جو جتنا لکھا گیا اس کی تفصیل اس کتاب میں ہے، اس کے بعد فاضل مصنف نے قلم اٹھایا اور نانوتہ، وہاں کے صدیقی خاندان، مولانا مملوک العلی کے خانوادے، بچپن، تعلیم، اساتذہ، دہلی کالج، تحریک سید احمد شہید سے وابستگی، اخلاق و مزاج، سفر حج، تصانیف، عربی اردو میں خطوط نگاری، فتاوی، کتب خانہ، وفات، اولاد و احفاد، تلامذہ وغیرہ عنوانوں کے تحت معلومات کا ایک خزانہ پیش کردیا ہے، تحقیقی و تجزیاتی شان بھی نمایاں ہے، بعض اہم بزرگوں کی تحریروں اور اطلاعات پر نقد و رد بھی ہے، گوکہیں کہیں حشو و زوائد سے طوالت کا احساس بھی ہوتا ہے، اساتذہ اور

تلامذہ کے حالات شاید اس درجہ تفصیل کے متقاضی نہیں تاہم ان کے فائدے سے انکار نہیں، شجرۂ نسب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پانچویں پشت میں شیخ سادھن صدیقی کا نام، مصنف کی نظر تحقیق کا مرکز بنتا تو شاید شجرہ نویسی میں کچھ باتیں اور بھی سامنے آجاتیں کہ خالص عربوں کو اتنی جلد اس قسم کا ہندوستانی نام رکھنے کا سبب کیا رہا؟ سرسید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دہلی کالج میں مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، فاضل محقق نے ثابت کیا کہ یہ خیال قطعی غلط ہے، چند اہم تصویروں، اشاریے اور کتابیات کی خوبیوں نے اس کتاب کو اور بھی زینت بخش دی ہے، شک نہیں کہ یہ کتاب استفادے کے ساتھ حوالہ کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

خطبات اقبال تسہیل و تفہیم: از ڈاکٹر جاوید اقبال، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۳۶، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۵، شاہراہ پاکستان (لوور مال) پوسٹ بکس نمبر ۹۹۷، لاہور، پاکستان۔

اقبالیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے اقبال کے مشہور خطبات مدراس، غیر مانوس نہیں یہ خطبات اہل علم میں بحث و تمحیص کا روز اول سے موضوع رہے، اقبال کو بھی شاید اس کا اندازہ تھا، اسی لیے کہنا پڑا کہ کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

ان کا یہ شاعرانہ احساس ممکن ہے ان خطبات کے متعلق بھی ہو کہ اپنے بھی خفا اور بیگانے بھی ناخوش، بہر حال یہ سات خطبات اپنے اسلوب اور معانی و مفاہیم کے اعتبار سے واقعی خواص کے لیے تھے، اسی لیے ان کی تفہیم کے لیے تسہیل کی ضرورت بھی محسوس ہوتی رہی، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک عمدہ کوشش ہے اور مقصد اس سے بھی عمدہ ہے کہ نئی نسل میں اقبال کے افکار کے مطابق احیائے اسلام اور احیائے تمدن اسلام کے جاری عمل کا شعور یا اہمیت کا احساس پیدا کیا جاسکے، کہا جاسکتا ہے کہ فاضل مصنف اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

مکاتیب سلیمان: از مولانا محمد زید مظاہری ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۰۸، قیمت درج نہیں، پتہ: ندوی بک ڈپو، ندوۃ العلما، لکھنؤ، مکتبہ الفرقان، نظیر آباد، لکھنؤ اور دیوبند و سہارن پور کے دیگر مکتبے۔

حیات مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک اہم باب مولانا اشرف علی تھانوی سے استرشاد، اصلاح

اور تربیت نفس کا ہے، اقلیم علم میں تخت سلیمانی پر فائز ہونے اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد ہونے کے باوجود اپنے درد کے درماں کی فکر رہی، علوم نبوت کے ساتھ نور نبوت کی تلاش رہی، اس فکر و تلاش کے نقوش ان دونوں بزرگوں کے درمیان خط و کتابت میں بڑے روشن اور نہایت دلکش ہیں، زبان ہوش مند، ذہن ارجمند اور فکر بلند کے ساتھ سید صاحب کو دل دردمند کی نعمت ملی تو یہ ان کی طلب صادق کی دلیل اور رہین ہے، سید صاحب مولانا تھانوی سے پہلی ملاقات میں مولانا کے تواضع، سادگی اور رعایت جلیس کی خوبیاں دیکھ کر متاثر بلکہ مسخر ہوگئے، اس پہلی ملاقات سے اپنے مرشد کی وفات تک اس تعلق کا ہر نقش، مختلف خطوط اور تحریروں میں موجود مگر منتشر رہے اس کتاب کے لائق مصنف نے خوب کیا کہ بڑے سلیقے سے ان بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پروکر اس کتاب کی شکل میں پیش کردیا، پوری کتاب پڑھنے کے لائق ہے، صحیح کہا گیا کہ یہ نقش سلیمانی کسی خوان یغما سے کم نہیں، شروع میں کئی اہل علم کی تقریظیں اسی بات کا ثبوت ہیں۔

حرف زار: از جناب فاخر جلال پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: فاخر جلال پوری، محلہ قاضی پورہ، جلال پور، امبیڈکر نگر یوپی اور لکھنو و دہلی کے مشہور مکتبے۔

جناب فاخر جلال پوری، اردو کے اساتذہ شعراء میں ہیں، حد درجہ تواضع، انکسار اور نام و نمود سے نفور کی دولت عموماً شعری قبیلے میں مفقود ہے لیکن صوفی مزاج شاعر کی پاکیزہ سرشت نے ان کے کلام کو مقبولیت عطا کی اور تقدس بھی، اس سے پہلے ان کے شعری محاسن و کمالات کے کئی تابندہ نقوش سامنے آچکے ہیں، زیر نظر مجموعہ کلام اس واردات قلب کا ایک اور صحیفہ ہے جس میں ان کی نظمیہ شاعری میں ان کے جذبوں کی فراوانی سمٹ کر آگئی ہے، حرف دعا سے اس مجموعہ کے آہنگ کا اندازہ ہوتا ہے اور یہیں سے ان کی شاعری کا مقصود بھی سامنے آجاتا ہے، جہاں بانی کے لیے جہاں بینی کے سلیقہ کی ضرورت اور جیلانی وسمنانی کی نسبت کی آرزو اور حدی خوانی کے ذوق کی طلب ظاہر کرتی ہے کہ وہ ان شعراء میں ہیں جن کو تلمذ رحمانی کی سعادت حاصل ہوچکی ہے، مطلع الفجر ہو یا انقلاب زندہ باد یا پیغام انقلاب یا پھر پاسبان مشرق، ہر نظم شاعر کے سچے اور خالص جذبات کے شاعرانہ اظہار کی بہترین مثال ہے۔

ع-ص